المسی



طلبائے سٹی کالج کا سہ ماہی رسالہ

جلد ہفتم
شمارہ سوم

بابت
اردی بہشت سنہ ۱۳۴۹ ف

الموسیٰ

طلبۂ سٹی کالج کا علمی و ادبی رسالہ

(زیرِ نگرانی)

جناب سید محمد اعظم صاحب ام۔اے، بی۔ایس سی (کینٹب) صدر کلیہ

جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب ام۔اے (لکچرار انگریزی)

جناب سید محمد صاحب ام۔اے (لکچرار اردو و فارسی)

(مجلس ادارت)

محمد مصطفیٰ [illegible] متعلم سالِ اول

خواجہ معین الدین متعلم سالِ اول

سید اکبر اعظم متعلم درجۂ ششم

نعیم الدین احمد متعلم جماعت دہم

گنگا دھر راؤ متعلم سالِ اول

معین الدین انصاری متعلم درجۂ ششم

پرتاب ریڈی متعلم جماعت دہم

قواعد

(۱) سٹی کالج کے طلبہ کا یہ سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ "الموسی" عموماً آذر، ہفندار خورداد اور شہریور کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کریگا۔

(۲) اس رسالہ میں عموماً طلبہ حال و سابق کے دلکش مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں شایع ہوا کرینگی۔ نیز کالج کی دلچسپ خبریں پرلطف انداز میں پیش کیجائینگی۔

(۳) علمی مسائل پر لیس اور تعلیمی مضامین بھی وقتاً فوقتاً شایع کیے جائینگے۔

(۴) دل آزار مذہبی تنقیدوں اور مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ کو کسی طرح جگہ نہیں دیجائیگی۔

(۵) رسالہ کی ضخامت عموماً (۱۰۰) صفحات پر ہوگی۔

(۶) سالانہ چندہ طلبہ حال سے دو روپیہ اور طلبا قدیم سے تین روپیہ اور دیگر خریداروں سے چار روپیہ لیا جائیگا۔

(۷) تمام مضامین نظم و نثر مدیر کے نام بھیجے جائیں اور ترسیل زر اور دیگر امور کے لیے مینیجر رسالہ سے خط و کتابت کی جائے۔

(۸) خلاف تہذیب اشتہارات شایع نہیں کیے جائینگے۔

فہرست

مطبوعہ

مطبع ابراہیمیہ

حیدرآباد دکن

اداریہ

"الموسی" کا یہ نمبر اپنے مقررہ وقت یعنے اردی بہشت کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے گزشتہ مہینے میں سٹی کالج کی تقریب یوم کلیہ جس شاندار پیمانے پر منائی گئی ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ الموسی کا بھی ایک خاص نمبر اس کے متعلق شائع کیا جائے اور پچھلے نمبر میں ہم نے اس کی توقع بھی ظاہر کی تھی۔ اس خاص نمبر کی اشاعت کے لئے کافی اہتمام کی ضرورت تھی۔ اس لئے ادارے نے یہ تصفیہ کیا کہ الموسی کا تیسرا نمبر حسب معمول وقت پر شائع کر دیا جائے اور اگلے مہینے کے شروع میں خاص نمبر کی اشاعت عمل میں آئے۔ چنانچہ انشاء اللہ آیندہ مہینے یہ خاص نمبر جس میں اس تقریب سے متعلق متعدد تصاویر اور مضامین ہوں گے، قارئین کے مطالعے میں پیش کیا جائیگا۔ اس کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

آیندہ مہینے کے تیسرے ہفتے سے تمام قارئین "الموسی" کو موسم گرما کی طویل تعطیلات ملنے والی ہیں۔ ہمارے کئی قارئین اضلاع اور دیہات کے رہنے والے ہیں وہ ضرور ان چھٹیوں میں اپنے وطن جائیں گے۔ کیا ہم ان کو اس موقع پر ایک ضروری فرض کی ادائی کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔ یہ فرض اپنے اَن پڑھ بھائیوں کو پڑھانے کا ہے۔ اگر ان کی کوشش سے ان چھٹیوں میں چند آدمی لکھنا پڑھنا سیکھ لیں تو یہ کتنی اچھی خدمتِ خلق ہو گی۔ ہم اپنے قارئین کی ایسی کوششوں کو آیندہ نمبروں میں شکریے کے ساتھ بیان کریں گے۔

مرجعِ شیخ و برہمن ہے زبانِ اُردو

غیرِ اُردو نے کسی کو بھی نہ ہرگز جانا — زیب تن اس نے کیا جس کو جو بھایا بانا
سیکھتا اس سے کوئی چیز ہی کیا اپنانا؟ — آلۂ کار اسے سب نے برا بر مانا

استتی اس میں ہوی۔ اس میں مناجات ہوی
دین اور دھرم کی اُردو، سے مدارات ہوی

امتیاز اس کو تو انسان سے انساں میں نہیں — حسد و رشک کا خار اس کے گلستاں میں نہیں
فرق اس کے لئے گبر او مسلماں میں نہیں — اس کو تمیزِ ذرا وید میں قرآن میں نہیں

شرک میں اس کے یہ وحدت نے جلا پائی ہے
جس پہ یکتائی فدا ہے یہ وہ ہرجائی ہے

آیئے ہم کریں مل جل کے سب اسکی خدمت — کیونکہ ہے اس کی بڑائی میں وطن کی عظمت
ہوگی اُردو، سے روا اہل وطن کی حاجت — پائے گا قوم کا جسم اس سے ہی کامل صحت

کیونکہ اصل اس کی موالات و رواداری ہے
اس کی گھٹی میں محبت ہے وفاداری ہے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

گردشِ زمانہ

آینی معصوم، دلربا اور بھولی بھالی سات سال کی لڑکی تھی۔ وہ دن بھر اپنے ہمسایہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتی۔ اسکے ساتھ کھیلنے والوں میں دو لڑکے تھے۔ فلپ پنساری کا بیٹا تھا اور دوسرا آینک، تھا۔ یہ ایک ملاح کا لڑکا تھا جو اپنے باپ کی ناگہانی موت سے یتیم ہوگیا تھا۔ ان تینوں میں بہت محبت تھی۔ وہ دن کا زیادہ حصہ کھیل کود میں گذارتے۔ اکثر اوقات کھیل میں اینک اینی کا شوہر بن جاتا۔ یہ بات فلپ کو حد درجہ ناگوار گذرتی۔ لیکن آینک طاقتور تھا۔ اسلئے وہ اپنی بات طاقت کے زور سے منواتا۔ غریب فلپ کمزور قویٰ کا مالک تھا۔ اس لئے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اینی دونوں میں کشیدگی بڑھنے کے خوف سے معصومانہ انداز میں کہتی " فلپ کیوں روتے ہو میں تم دونوں کی بیوی ہوں"

زمانہ گذرتا گیا۔ آینی، فلپ اور آینک بڑھتے گئے اور ساتھ ہی ان کا جذبہ محبت بھی۔ اینک علانیہ اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا اور ایک حد تک آینی کی نظروں میں جچ گیا۔ لیکن فلپ دل ہی دل میں اینی کی موہنی صورت کی پرستش کیا کرتا تھا۔

(۲)

خزاں کے آخری دن تھے۔ آبادی سے کچھ پرے پہاڑ کے دامن میں چسٹ نٹ کے درخت کثرت سے تھے۔ گاؤں کے اکثر بچے یہاں پھل چننے کے لئے آیا کرتے تھے۔ فلپ بھی ایک دن چسٹ نٹ کے درختوں کے قریب پہنچا تو ایک آواز سُنکر ٹھٹھک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ " آہ! آینک تم نہیں جانتے میں

تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ تم شادی کے لئے کہتے ہو۔ وہ دن بھی دور نہیں جبکہ ہم خوشگوار زندگی بسر کرینگے" قلپ زیادہ نہ سن سکا۔ اور اس طرح وہاں سے چلا آیا جس طرح ایک جانور زخم کھانے کے بعد جھاڑیوں میں رُوپوش جاتا ہے۔

— ۳ —

اینک اور آینی کی شادی ہو گئی۔ انکی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ اینک دن بھر مچھلیاں پکڑتا اور شام کو گھر واپس آتا۔ آینی اسکے لئے کھانا تیار کرتی۔ خدا نے انکو دو پھول سے بچے دئیے۔ آینک اب اس فکر میں تھا کہ کسی طرح آمدنی میں اضافہ کرے اور اپنے بیوی بچوں کو زیادہ آرام سے رکھے۔ جس جگہ وہ مچھلیاں پکڑتا تھا اُس سے دس میل کے فاصلہ پر ایک نئی بندرگاہ تعمیر ہوئی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ اگر وہاں جاکر کاروبار کیا جائے تو زیادہ آمدنی ہونے کی امید ہے۔ اب وہ بندرگاہ جانے لگا۔ ایک دن جہاز کے کپتان نے اس سے دریافت کیا" اگر تم جہاز کی صفائی کرنے پر نوکر ہو جانا چاہو تو اس سے کہیں زیادہ کمالوگے" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اینک جہاز پر نوکری کرنے لگا۔ وہ ایک دن اسی طرح جہاز کے مستول پر چڑھکر کام کر رہا تھا کہ اتفاق سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے تختۂ جہاز پر آرہا۔ جسکی وجہ سے اسکو سخت چوٹ آئی اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اینک کئی مہینوں تک فراش رہا اس عرصہ میں جہاز پر کسی اور شخص نے نوکری کرلی۔ آینک اب مچھلیاں پکڑنے سے بھی عاجز تھا۔ وہ اور اس کے بیوی بچے عسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ انہی دنوں انھیں ایک اور بچہ پیدا ہوا جو بہت کمزور اور دائم المریض تھا۔ جب اینک کا ہاتھ درست ہو گیا تو وہ کام کی جستجو کرنے لگا ایک دن اسکی ملاقات جہاز کے ایک کپتان سے ہوی جو تجارت کی غرض سے دور دراز ممالک کو جارہا تھا۔ اینک بھی بحیثیت ملازم اس کے ساتھ ہو لیا۔

— ۴ —

دس سال گذر گئے۔ آینک کا کوئی پتہ نہ تھا۔ آینی اب بھی اس کا انتظار کرتی تھی۔ آینی کو اس طویل عرصہ میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکی چھوٹی سی دوکان جو اینک نے جاتے وقت، آینی کی گذر بسر کے لئے قائم کردی تھی بہت جلد تباہ ہو گئی۔ کیونکہ اینی تجارت کے گر سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس اثنا میں قلپ کو اینی کے ساتھ ہمدردی کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔ اس نے وقتاً فوقتاً اینی کی مشکلات کو بہت کچھ کم کیا۔ اور اسکے بچوں کو اسکول میں داخل کردیا۔ وہ انکو کھلونے بھی لاکر دیتا۔ چھوٹے بچے قلپ کی اس شفقت سے متاثر ہو کر اسے " قلپ ابّا " کہنے لگے۔

— ۵ —

ایک دن آینی بچوں کے ساتھ "چیسٹ نٹ" چننے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ اتفاق سے فلپ بھی وہیں آنکلا۔ بچے پھل چننے میں مشغول تھے۔ آینی اور فلپ ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھکر معصوم بچوں کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ فلپ کو ان بچوں کی حرکات و سکنات نے اپنے بچپن کا زمانہ یاد دلا دیا جب وہ بھی انہی طرح شاہی دن گذارتا تھا۔ وہ منظر اسکی آنکھوں میں پھر گیا جبکہ اینی اور اینک کو اس نے شادی کا قول و قرار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اینی کی مصیبتیں بھی یکے بعد دیگرے سینما کے فلم کی طرح اسکے سامنے آئیں۔ فلپ چند دن سے اینی کی محبت کو اپنے قلب میں بہت زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر کہنے لگا:-

"اینی آخر تم کب تک امید و بیم کی زندگی میں مبتلا رہو گی۔ اینک کو گئے ہوئے دس سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں تم نے جو تکلیفیں اٹھائیں ان کے خیال سے بھی دل لرزتا ہے۔ میری اینی! تم اپنے اور اپنے بچوں پر ظلم کر رہی ہو۔ میں ایک بات تم سے کہتا ہوں وہ یہ کہ میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ اینی! میری محبت کو نہ ٹھکراؤ اور مجھ سے شادی کر لو"

آینی نے ان باتوں کو خاموشی سے سنا اور کہنے لگی۔ "اس میں شک نہیں کہ مجھ پر تمھارے احسانات بہت ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ تا زیست میں ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ پھر دوبارہ کسی سے محبت کر سکوں۔ شاید آینک زندہ ہے"

نہیں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اینک زندہ نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور اپنی اطلاع دیتا" فلپ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

اینی نے جواب دیا "اچھا مجھے ایک سال اور ٹھہر جانے دو" یقیناً جس طرح میں نے اینک سیمابی کیفیت میں اپنی عمر گذاری ہے۔ ایک سال اور سہی۔ فلپ نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

(۶)

وقت ٹل گیا لیکن اینک نہ آیا۔ اینی اب بالکل نا امید ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس نے فلپ سے ایک ماہ کی مہلت چاہی۔ بالآخر مجبور ہو کر اس نے فلپ سے شادی کر لی۔ وہ اس شادی سے خوش نہ تھی۔ اسکو ہر وقت اینک کے آنے کا خدشہ لگا رہتا۔ انھیں دنوں اس کا بیمار بچہ مر گیا۔ لیکن فلپ سے اسکو دو اور بچے ہوئے۔

(۷)

اینک تجارت سے بے شمار دولت کما کر وطن لوٹ رہا تھا کہ اس کا جہاز طوفان میں آکر تباہ ہو گیا جہاز کے ملاح اور کپتان سب ڈوب گئے۔ صرف آینک اور دو مسافر بچ گئے۔ قدرت نے انکو ایک ایسے جزیرے پر پہنچا دیا جو ابھی انسانی تمدن سے ناآشنا تھا۔ اینک اور اسکے ساتھیوں نے یہاں بھی بہت مصائب جھیلے۔

ان تین قسمت کے ماروں میں دو چل بسے اور آخر کار اینک تنہا رہ گیا۔ وہ دن بھر غذا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور تھک کر جب درختوں کے سایہ میں بیٹھ جاتا اسے یہ محسوس ہوتا کہ اپنے اہل و عیال کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ محلہ کے مکانات اور چھوٹا گرجا جسمیں وہ ہر اتوار کو نماز کے لئے جاتا اسکو نظر آتے۔ لیکن جب کوئی جانور کی مہیب آواز جنگل میں گونج اٹھتی تو وہ یک لخت چونک اٹھتا۔ دو سال گذر گئے۔ اینک کثرت آلام و مصائب کی وجہ سے قبل از وقت بوڑھا ہو گیا اسکے بال سفید ہو گئے اور قویٰ کمزور۔

ایک دن ایک جہاز مخالف ہواؤں کی وجہ سے اس جزیرہ کے کنارے آ لگا۔ ملاح پانی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اور اثنائے تلاش میں اینک کو پالیا۔ اینک انسانی وجود سے یک لخت چونک پڑا۔ اس نے مدت مدید کے بعد انسانی آواز سنی۔ ملاح کی زبان اسکو مطلق سمجھ میں نہ آئی۔ بالآخر اشاروں سے اتنا سمجھ سکا کہ انکو پانی کی ضرورت ہے۔ اینک نے انکو پانی کی جگہ تبلائی۔ جہاز کے کپتان نے اسکی یہ حالت دیکھی تو اس سے نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اسکو اس کے وطن پہنچا دیا۔

۸

ساحل سے وہ سیدھے اپنے گھر پہنچا۔ لیکن اب وہاں کیا دھرا تھا اس نے گھر کی جگہ خاک اڑتی ہوئی دیکھی اور نہایت مایوسی کے ساتھ لوٹا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے قریب ہی تھا کہ وہ گرے۔ لیکن فوراً سنبھل گیا اور ایک قریب کی سرائے میں چلا گیا۔ کئی دن تک وہ وہیں مقیم رہا۔ ایک دن اس نے سرائے کی بوڑھی مالکہ سے اپنی ہی داستان سنی۔ مریم (سرائے کی مالکہ کا نام) اینک کو نہ پہچان سکی کیونکہ اسکی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ ایک ایک کر کے اینک کو سب واقعات معلوم ہو گئے کہ کس طرح اس کا بچہ مر گیا۔ اینی کی غربت میں فلپ کا مدد کرنا بچوں کو اسکول میں داخل کرنا اور فلپ کا اینی کو شادی کے لئے مجبور کرنا۔ اور پھر فلپ کے بچوں کا پیدا ہونا۔ ان تمام واقعات کو اس نے سکتہ کی سی حالت میں سنا اور بڑی حد تک مریم پر کسی قسم کی اپنی پریشانی اور یاس کا اظہار نہ کیا۔ اب اس کے دل میں کسی قسم کی آرزو نہ تھی۔ پھر بھی وہ ایک دفعہ اینی کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ اس ارادہ سے فلپ کے گھر کا پتہ پوچھکر روانہ ہوا۔

۹

ایک شام جبکہ گہری کہر چھائی ہوئی تھی۔ اینک فلپ کے گھر کے پیچھے، باغ میں داخل ہو کر ایک اونچے درخت چڑھ گیا اور گھر کی حالت دیکھنے لگا۔ ایک طرف آگ جل رہی تھی۔ اسکے ایک جانب فلپ بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی گود میں ایک خوبصورت بچہ تھا۔ ایک لڑکی اسکے پشت پر جھکی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر اینی بیٹھی ہوئی تھی۔ اینک اب زیادہ دیکھنے کی تاب نہ لاسکا۔ اور ان واقعات کو دیکھکر اتنا متاثر ہوا کہ قریب تھا کہ وہ بیہوش

ہو کر گر جاتا۔ لیکن سنبھلا اور بمشکل درخت سے اتر کر سرائے میں پہنچا۔ اسکی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اسکو سخت بخار تھا۔ دوسرے دن جب اسکی حالت بہت نازک ہونے لگی تو اس نے مریم سے کہا "تم اُس دن مجھے جس نوجوان کا قصہ سنا رہی تھیں وہ بدنصیب میں ہی ہوں"۔ یہ سنکر مریم کے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ "کیا تم وہی نوجوان ہو جو اس محلہ کا سب سے طاقتور شخص تھا"۔ اینک نے کہا "ہاں میں ہی وہ شخص ہوں جو زمانہ کی نشیب و فراز سے اس حالت کو پہنچ گیا ہے"۔ مریم سنتی جاتی تھی اور بے اختیار رو رہی تھی۔ اینک نے کہا "تم اینی سے اتنا کہدینا کہ میں نے اسے معاف کیا...... اور ہاں فلپ کو بھی معاف کیا اور یہ بھی کہنا کہ اگر میرے بچے مجھے دیکھنا چاہیں تو وہ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اینی کو نہ آنے دینا کیونکہ اسکی زندگی بالکل تلخ ہو جائیگی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ایک زور کی ہچکی آئی اور اُس نے دم توڑ دیا۔ ہوا زور سے چل رہی تھی۔ بوڑھے زرد پتے اینک کے جنازے کے شاندار جلوس پر گر رہے تھے۔ شاید انھوں نے اتنا جلوس نہ دیکھا ہوگا۔

(ترجمہ از ٹینیسن)

سید خواجہ مظفر الدین متعلم سال اول۔

ہماری فٹبال ٹیم کا دورہ جنوبی ہند

از
جناب مقصود شاہ خاں صاحب یم یس سی۔ مددگار

یہ ایک بالکل صحیح مقولہ ہے کہ انسان بغیر تجربے کے مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ ایک عالم محض علم کی بنا پر مکمل انسان نہیں کہلایا جاسکتا تعلیم یافتہ آدمی کا تجربہ کار ہونا بھی ضروری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کے لئے ان کے دوران تعلیم میں سال میں ایک یا دو دفعہ تعلیمی اور تفریحی سفر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اس خیال کے مدنظر ہمارے لایق، تجربہ کار اور ہردلعزیز پرنسپل عالیجناب سید محمد اعظم صاحب نے اس سال ہماری فٹبال ٹیم کے لئے جنوبی ہند کا سفر منظور فرمایا۔ اور موسم سرما کی ایک ہفتہ کی تعطیلات میں چوبیس ۲۴ طلبا کی ایک جماعت مولوی سید جمیل احمد صاحب کی قیادت میں روانہ ہوی۔ یہ مضمون اسی سفر کے حالات کا عکس ہے

دوشنبہ ۲۵ ر دسمبر کی صبح ۶ بجکر ۴۰ منٹ پر ہماری گاڑی کاچی گوڑہ اسٹیشن سے روانہ ہوی۔ تمام لڑکوں نے وقت سے کچھ پہلے ہی اسٹیشن پہنچکر اپنا اپنا سامان حفاظت سے ڈبہ میں رکھا۔ یا تھا۔ تمام لڑکوں کے آنے کے بعد جناب شاہ صاحب نے ٹکٹ خریدے شاہ صاحب ابھی ٹکٹ گھر ہی میں تھے کہ گاڑی نے سیٹی دی اور حرکت میں آئی۔ یہ دیکھکر سب کو بیحد تشویش ہوی۔ اسی وقت شاہ صاحب ٹکٹ گھر سے برآمد ہوے۔ اور گاڑی کو رفتار میں دیکھکر پہلے تو کچھ جھجکے لیکن بعد میں تیزی کے ساتھ تعاقب کیا اور بڑی مشکل سے اخیر ڈبہ میں سوار ہوسکے۔ اس لئے کہ اسوقت تک گاڑی کافی رفتار میں آچکی تھی۔ پلیٹ فارم کو ختم ہوے مشکل سے چند منٹ گذرے ہونگے کہ ایک دوا فروش صاحب نے بآواز بلند اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا "ہماری کمپنی نے پبلک کی آسانی کیلئے" اتنے میں ہر طرف سے ضرورت نہیں "دوسرے ڈبہ میں جایئے" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اور موقع شناس دوا فروش نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ چپ چاپ وہاں سے چلا جائے

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی مشق سے خوب فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ تقریباً ڈھائی تین گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد ایک جماعت مطالعہ میں منہمک نظر آنے لگی اور دوسری گانے بجانے میں۔

ایک گجراتی صاحب بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ ایک صاحب نے اپنی زمانہ شناس نظروں سے پتہ چلا لیا کہ ان کے پاس توشہ کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس سراغ رسانی سے اکثروں نے بے تکلفی بڑھانے کے لئے پچھے دو باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک صاحب نے اتفاق و اتحاد پر اپنے پورے حلومات کا اظہار فرمانا شروع کیا۔ دوسرے صاحب نے کہا مجھے تو صرف گجرات کے لوگ بیحد پسند ہیں۔ یہ لوگ سچے دوست ہوتے ہیں۔ تیسرے صاحب بول اُٹھے یوں تو بہت سے اقسام کے کھانے کھائے ہیں مگر جو لذت گجراتیوں کے کھانوں میں ہوتی ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ اسوقت تک دوپہر ہو چکی تھی۔ کھانے کا وقت آگیا تھا سبھوں نے اپنے اپنے توشے کھولے۔ اور گجراتی ہم سفر کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ پہلے تو انھوں نے اخلاقاً انکار کیا۔ لیکن بعد میں اصرار کرنے پر رضامند ہوگئے اور اپنا توشہ دان ان نئے دوستوں کے آگے رکھدیا۔ سبھوں نے اپنی اپنی تعریف کا دل کھول کر ثبوت دیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک چار کے دور چلتے رہے اور سوا چار بجے کے قریب ہم گنتکل اسٹیشن پہنچے۔ تقریباً ۶ ½ بجے یہاں سے روانہ ہوکر دوسرے روز صبح ۶ ½ بجے بنگلور پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد نکلکر (۲۳) گھنٹہ کے متواتر سفر کے بعد ۲۶۔ دسمبر کی دوپہر میں تقریباً ۳ بجے میسور اسٹیشن پہنچ گئے۔

ہمارے سامنے قیام کا اہم مسئلہ تھا۔ ماڈرن ہندو ہوٹل اور دوسرے بڑے ہوٹلوں میں بالکل جگہ نہ تھی تعطیلات کا زمانہ ہونیکی وجہ سے مہاراجہ کالج کے اقامت خانے بھی بند تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک بنگلہ میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ سبھوں نے اس مکان کو پسند کیا۔

میسور شہر بہت چھوٹا ہے لیکن یہاں کا دسہرہ تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ہیں جدھر دیکھو سبزی ہی سبزی نظر آتی ہے۔ میسور شہر نہیں ہے گلشن ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا فرق کرنا بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ میں نے ایک صاحب کو لفظ "مہاراج" سے مخاطب کیا۔ وہ مسکرائے اور فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اس پر مجھے کچھ ندامت ہوئی اور میں نے معاف مانگ لی۔ صاحب موصوف نے جو جامعہ میسور کے طیلسانی تھے فرمایا کہ

"خواہی نہ شوی رسوا ہمرنگ جماعت شو"

دوسرے روز یعنی ۲۷ر دسمبر کی شام میں "پیالیس انفنٹری" فٹبال ٹیم سے میاچ مقرر ہوا۔ یہ ٹیم میسور کی سب سے اچھی ٹیم مانی جاتی ہے۔ اور ۲۸ر دسمبر کی شام میں چالینج یونین فٹبال ٹیم سے مقابلہ طے پایا۔ ہمارے سفر کا پہلا میاچ پیالیس انفنٹری کے مقابلہ میں مہاراجہ کالج گراؤنڈ پر ٹھیک (۵) بجے شروع ہوا۔ حیدرآباد کا نام سنکر میسوریوں کی کافی تعداد کھیل دیکھنے کے لئے جمع ہوگئی تھی۔ اور ان میں سے اکثروں کا خیال تھا کہ ہماری ٹیم ایک آدھ درجن گول سے ہار جائیگی۔ کھیل

شروع ہونے کے پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر ہم نے ایک گول بنایا۔ تمام میسوری حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں اسوقت جبکہ تین منٹ باقی تھے۔ مقابل ٹیم کی محنت بارآور ثابت ہوئی اور وہ ایک گول واپس کرنے کے قابل ہوئے۔ کھیل بےحد دلچسپ تھا اور ہمارے اکثر کھلاڑیوں نے میسوریوں سے اپنے کھیل کی داد لی۔ چنانچہ انور۔ فیض محمد۔ قیوم۔ خورشید علیخاں کا کھیل نمایاں رہا۔

میسور میں قابل دید مقامات حسب ذیل ہیں:۔

"باغ حیوانات۔ گرجا۔ مہاراجہ پیالیس۔ مارکٹ۔ ریلوے آفس۔ سنیٹوریم۔ مہاراجہ کالج وغیرہ"

ہمیں ان تمام عمارتوں کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ مہاراجہ پیالیس۔ باغ حیوانات اور سنیٹوریم میں بعض خاص چیزیں دیکھکر ہم بیحد متاثر ہوئے۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد کچھ خرید و فروخت کر کے اکثر ہیاح کے خیال سے آرام لینے کے لئے مکان واپس آگئے۔ کھیل جیا لنچ یونین سے تھا لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس میں ینگ ہیروز اور مہاراجہ کالج میسور کے بھی کھلاڑی کھیل رہے تھے غالباً وہ ہمارا گذشتہ کھیل دیکھنے کے بعد ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ کھیل اس گراؤنڈ پر تقریباً اسوقت شروع ہوا اور ہم دو گول سے ہار گئے۔ مخفی مبادا کہ موخرالذکر دونوں ٹیمیں بمبئی اور مدراس ٹورنمنٹ میں کافی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہماری مقابل کی متحدہ ٹیم کس نوعیت کی ہوگی۔

کھیل ختم ہوتے ہی ہم چومنڈی پہاڑی دیکھنے روانہ ہوئے۔ اور ٹھیک ۷ ½ بجے پہاڑی پر پہنچے۔ اوپر سے شہر کی روشنی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان مع اپنے تمام جھلملاتے تاروں کے نیچے اتر آیا ہے۔ یہاں مہاراجہ کا ایک چھوٹا اور سادہ محل ہے۔ یہاں سے نکل کر کرشنا ساگر پہنچے جو آبادی سے تیرہ میل دور واقع ہے۔ اس کا بند غالباً دو میل لمبا ہے۔ بند کے نیچے ایک باغ ہے جہاں نہایت ہی دلچسپ چمن بندی کے علاوہ پانی کو اسکی اپنی طاقت کی بناء پر مختلف اقسام کے فواروں میں تبدیل کیا گیا ہے اور رات کے وقت ان پر رنگ برنگ کی روشنی ڈالی جاتی ہے جس سے منظر اور بھی پرکیف ہو جاتا ہے۔ تقریباً ۱ ½ گھنٹہ اس "باغ ارم" سے لطف اندوز ہوکر ٹھیک ۱۰ بجے ہم مکان پہنچے۔

دوسرے روز یعنی ۲۹ ر دسمبر کی صبح ہم موٹر بس کے ذریعہ "سرنگا پٹم" پہنچے۔ یہاں ٹیپو سلطان ؒ کا مقبرہ ہے۔ ٹیپو سلطان کے بازو حیدر علی اور انکی اہلیہ کی بھی قبریں ہیں۔ یہ قبریں غیر معمولی طور پر لمبی ہیں۔ مقبرہ میں داخل ہونے کے بعد دلوں پر ایک خاص قسم کا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ مقبرہ سے متصل ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ اسکے بعد دریا دولت (ٹیپو کا گرمائی محل) دیکھتے ہوئے کاویری آبشار دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔

ٹھیک بارہ بجے قدرتی آبشار پر پہنچکر کھانا کھایا۔ اس آبشار میں تقریباً ۸۰ فیٹ بلندی سے پانی نیچے گرتا ہے کچھ دیر اس کا لطف اٹھا کر مصنوعی آبشار کی راہ لی۔ ریاست میسور کی خوش قسمتی سمجھنی چاہیئے کہ ایسی زبردست آبشار

سکے حدود میں واقع ہے۔ اور ہماری خوش نصیبی تھی کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس آبشار کے سامنے کی پہاڑی پر ریاست میسور کے حدود ختم ہوتے ہیں۔ مصنوعی آبشار پر پہنچکر ترائی کی۔ ۔ ۔ ۵۰ فیٹ نیچے اس مقام پر پہنچے جہاں برقی پیدا کیجاتی ہے مشین کا تفصیل سے معائنہ کیا اور ایک گھنٹہ بعد وہاں سے واپس ہوئے۔ مغرب تک میسور پہنچ گئے اور اسی شام کی گاڑی سے روانہ ہو کر ۳۰ر دسمبر کی صبح ۶ ½ بجے بنگلور سٹیشن پر اترے۔

اسٹیشن سے نکل کر نواب مولوی غلام احمد صاحب کلامی سے صاحب موصوف کے مکان پر ملاقات کی۔ ہم صاحب موصوف کے بیحد ممنون ہیں کہ عالیجناب نے بغیر کسی اطلاع کے ہمارے لئے مسلم ہال میں قیام کا انتظام فرمایا۔ اور دوسری تمام سہولتیں بھی بہم پہنچائیں۔ مسلم ہال میں مختلف مدارس کے مسلمان بچے مقیم ہیں۔ اس اقامت خانہ کا نظم وضبط دیکھکر ہمیں بیحد خوشی ہوئی۔ بعض اوقات ہمیں ایسا پرانے زمانے کی درسگاہوں کا شبہ ہو رہا تھا

بنگلور جنوبی ہند کا حسین ترین شہر ہے۔ اصلی شہر بلکل قدیم وضع کا ہے البتہ کنٹونمنٹ کی سڑکیں کشادہ اور صاف ہیں یہاں کی آبادی زیادہ تر یورپین ہے اس لئے مکانات نہایت سلیقے کے ہیں۔ کنٹونمنٹ کارکیٹ۔ کمرشیل اسٹریٹ۔ سنٹرل کالج۔ ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ آف سائنس۔ کبن پارک۔ اور ساؤتھ پریڈ یہاں کے قابل دید مقامات ہیں۔

۳۰ر دسمبر کی شام سنٹ جوزف کالج سے میاچ مقرر تھا۔ کھیل وقت پر شروع ہوا اور مقابلہ برابری پر ختم ہوا۔ گراؤنڈ چھوٹی تھی اور مقابل کے تمام کھلاڑی بوٹ سے کھیل رہے تھے اسی گراؤنڈ میں ہماری طرف دو گول ہوگئے۔ مگر اسکے باوجود ہمارے کھلاڑی برابر ہمت کے ساتھ کھیلتے رہے اور نہ صرف دو گول واپس کر دیئے گئے بلکہ ایک تیسرا گول بھی بنایا گیا جسکو غالباً رفری صاحب نے دینا مناسب نہ سمجھا۔

یہاں کا دوسرا کھیل ۳۱ر کی صبح ۹ بجکر ۲۵ منٹ پر شروع ہوا۔ جس میں ہمیں تین گول سے شکست ہوئی۔ اس کھیل میں ہارنے کے کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند اہم ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) مقابل کی ٹیم کرسنٹ بنگلور تھی جس کا شمار ہندوستان کی اچھی ٹیموں میں ہوتا ہے۔ اسکے چند کھلاڑی ہندوستان کی مشہور ٹیم "محمڈن اسپورٹنگ" کے کھلاڑی ہیں چنانچہ ہمارے مقابل بھی ایسے کھلاڑی موجود تھے۔

(۲) ہمارے کھلاڑی صبح میں کھیلنے کے عادی نہیں ہیں۔ تقریباً ۹ ½ بجے تک بھوکے رہکر کھیلنے کا ہمارے کھلاڑیوں کے لئے یہ زندگی میں پہلا موقع تھا۔

(۳) اسی روز شام میں سنٹرل کالج سے میاچ مقرر تھا۔ اسکے بعد صبح میں ہم نے (۱۹) سالہ بچوں کی ٹیم بنائی تھی جس میں انور۔ خورشید۔ فیض اور قیوم جیسے اچھے کھلاڑی موجود نہ تھے۔

اسی روز شام میں ٹھیک ۵ بجکر ۵ منٹ پر سنٹرل کالج سے انہیں کے گراؤنڈ پر میاچ شروع ہوا۔ کھیل دیکھنے کے لئے کالج کے اساتذہ۔ طلباء کے علاوہ دوسرے شائقین کی بھی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ کھیل بڑا دلچسپ ہوا۔ کچھ دیر

گذرنے کے بعد ظہور الدین کا ٹخنہ خراب ہو گیا اور ہم دس کھلاڑیوں سے کھیلتے رہے۔ لیکن اسکے باوجود بھی ہمارا اچھا کھیل بڑھتا رہا اور ہم نے پانچ گول بنائے۔ مقابل کی ٹیم صرف دو گول بنا سکی۔ اس طرح ہمیں تین گول سے کامیابی ہوئی۔ غوث، سعید انور، محمد علی، ناصر دو اور امام علی کا کھیل اچھا رہا۔

بہت سے بنگلوری حضرات نے اپنی اپنی ٹیم سے میاچ کھیلنے کے لیے ہم سے خواہش کی لیکن چونکہ اسی رات واپس ہونا تھا اس لیے ان تمام حضرات سے ہمیں معافی چاہنی پڑی۔ آخیر میں ہم ان تمام مختلف ٹیموں کے کپتانس کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے بہت ہی آخری وقت کی اطلاع پر بھی ہمیں نا امید نہیں کیا۔ اور سب سے آخر میں اُن عریف صاحبان کے بھی ہم بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنے اپنے فرائض کمن و خوبی انجام دیکر ہمارے انتظامات میں سہولت بہم پہنچائی۔ خاص طور پر اشفاق، عریف منعالیٰ اور انور عریف طعام قابل ذکر ہیں۔ اسکے بعد ہم ٹیم کے کپتان معین الدین کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے اسلئے کہ اس سفر کی تمام تر کامیابی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

۳۱ر دسمبر کی شام میں تقریباً ۱۰ بجے بنگلور سے روانہ ہوئے۔ اور دوسرے روز شب میں ۹ بجے کاچی گوڑہ اسٹیشن پہنچے۔ سبھوں نے اپنا اپنا سامان اتارا اور اپنے ہر دلعزیز پرنسپل صاحب کے لئے تین چیرز اور مولوی سید جمیل احمد صاحب کے لئے تین چیرز۔ دیکر سبھوں نے ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

ہندستان میں آریاؤں کی آبادکاری اور دیہات کی نوعیت

(مترجمہ) سید مہدی حسین صاحب (عثمانیہ)

قدیم زمانہ میں ہندستان کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک شمال مشرق میں آسام اور بنگال پر سے، دوسرا شمال مغرب میں دریائے سندھ کے علاقے پر سے۔ آریا جو اس ملک میں شمال مغربی راستے داخل ہوے۔ پہلے پہل وادی سندھ اور پنجاب کے میدانوں پر قابض ہوے اور پھر دریائے جمنا کے مشرق میں سرسوتی تک پھیل گئے۔ بعدازاں وہ بنگال میں بھی پھیل گئے اور وہاں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحری راستے براہ سیلون۔ اور جاوا بھی جا پہنچے۔ البتہ کوہ وندھیاچل اور ارَاولی پربت کی دشوار گذار گھاٹیوں کی بدولت یہہ لوگ ایک عرصہ دراز تک دکن اور جنوبی ہندستان میں بہ تعداد کثیر نہ داخل ہو سکے اور ان پہاڑوں کے جنوب کا علاقہ مدت دراز تک دراوڑیوں ہی کی علمداری میں رہا۔ اگرچہ رفتہ رفتہ شمال کے آریائی تمدن کا اس پر اثر بڑھتا گیا۔

رعیت واری گاؤں ان نئے آریائی آبادکاروں کو ہندستان میں بسنے کے لئے زمین کی کوئی کمی نہ تھی اور جتھابندی کے نمایاں فوائد کے مدنظر دو قسم کے گاؤں معرض وجود میں آئے۔ ایک تو وہ گاؤں ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں "رعیت واری گاؤں" کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر ایک خاندان یا قبیلہ اتنی زمین پر قابض و متصرف ہوتا تھا جس پر وہ اپنے مویشی اور قبیلے کے تنومند لوگوں کے

ساتھ کاشت کر سکے۔ ان گاؤں کے لئے ندی یا نہر کا کنارہ یا پھر آبرسانی کے کسی اور ذریعہ کے قریب کی موزوں جگہ منتخب کی جاتی تھی۔ گاؤں کے باشندے مل کر ایک شخص کو اپنا پٹیل مقرر کرتے جو اپنی جماعت کی طرف سے ہر قسم کے اختیارات استعمال کرتا تھا۔ ایسے گاؤں ہمیشہ پُر امن رہے ہیں۔

مشترکہ گاؤں

دوسرے قسم کے گاؤں جن کو بیڈن پاول نے مشترکہ گاؤں کہا ہے۔ طاقتور خاندانوں یا قبیلوں کے بسائے ہوئے ہیں۔ جن کا کاشتکار ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان گاؤں کی حکومت پنچایت کے قدیم طریقے پر ہوتی تھی اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ اس قسم کے کئی ایک گاؤں ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے یا کسی جنگجو سردار کے ماتحت ہوتے تھے ان گاؤں میں کاشتکار جماعت کی حیثیت بعض اوقات زمینداروں کی سی ہوتی تھی اور بعض دفعہ رعیت واری گاؤں کسی جنگجو سردار کی فتح یابی پر مشترکہ گاؤں بن جاتے تھے۔

گاؤں زمانہ قدیم میں

بعض پرانی کتابوں میں جیسے چانکیا کی ارتھ شاستر (۳۰۰ ق.م) منو کی سکرانتی اور سمرتی نیز حال کے برآمد شدہ کتبات سے قدیم زمانے میں گاؤں کی تنظیم حکومت اور ان کے قدیم اداروں کا خاصا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آگم اور جنوبی ہند کی دوسری تعمیر کارانہ کتابوں سے گاؤں کے خاکے اور ان کی تعمیر سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ گاؤں کی تعمیر میں مندر نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے گاؤں شمال کے آریائی اثر کے بغیر ہی ہر آئینہ مکمل ہوتے تھے۔ چنانچہ بعض مستند مصنفین کا یہ خیال ہے کہ آریاؤں کے بعض دیہی ادارے دراوڑیوں سے لئے گئے ہیں آج بھی ان گاؤں کے بنیادی خاکے ان لوگوں کے لئے قابل مطالعہ ہیں جو دیہات سدھار یا قصبوں کی تعمیر جدید کا کام کر رہے ہیں۔ مانسار (۵۰۰ ع) میں بڑی تفصیل کے ساتھ گاؤں، قصبوں اور قلعوں کی تعمیر کے خاکے مکانوں، محلوں، پبلک ہال اور تماشا گھروں وغیرہ جیسی عمارتوں کے نقشوں اور ان کی بلندی کا ذکر کیا گیا ہے۔

پٹیل

گاؤں کی حکومت میں پٹیل نہایت ہی اہمیت رکھنے والا عہدہ دار ہوتا تھا۔ اسکی خدمت موروثی ہوتی تھی اور بظاہر وہی عہد قدیم کے گاؤں کے سردار کی یادگار ہوتا تھا۔ اس خدمت کے معاوضے میں اسکو چند اراضی پر نا قابل انتقال حقوق حاصل ہوتے تھے۔ بعد میں اس کو چند قسم کے محصول لینے اور ان سے استفادہ کرنے کا حق بھی مل گیا۔ مثلاً یہ کہ ہر سال گاؤں کے موچی سے دو جوڑے جوتے، جلاہے سے دو تھان کپڑا تنبولی سے روزانہ (۲) پان اور دوکانداروں سے کچھ نقدی حاصل کرنا۔ گویا وہ گاؤں کا بادشاہ ہوتا تھا۔

گاؤں کی پنچایت

گاؤں کی پنچایت پٹیل کو مدد دیتی تھی لیکن بعد میں اس کی حیثیت اس پر ایک اعلیٰ

نگران کی ہوگی۔ یہہ گاؤں کے اُن غیر منتخب بزرگوں کی کونسل ہوتی تھی۔ جو گاؤں کے بزرگوں میں کم و بیش خودساختہ ہوتے تھے مگر گاؤں والوں میں ان کی کافی عزت و توقیر ہوتی تھی گاؤں کے مندر میں مقدموں کا فیصلہ ہوتا تھا۔ اور مقامی دیوتا کے آگے حلف لینا، عوام کو جھوٹی گواہی سے باز رکھنے کا موثر حربہ تھا پنچایتی یا پنچایت دار مدعی اور مدعا علیہ سے ذاتی طور پر واقف ہوتے تھے، اسلئے جلد فیصلہ صادر کرنے میں انھیں سہولت ہوتی تھی۔ پنچایت کی طرف سے ایک دیہی فنڈ قائم ہوتا تھا اور اس سے گاؤں کی ضروریات کی سربراہی میں بڑی سہولت ہوتی تھی۔ برطانوی حکومت کے تسلط کے بعد بھی مہاراشٹری علاقے کے بائیس فیصد گاؤں کے لگان وصول کرنے کا اختیار گاؤں والوں ہی کو دیا گیا

خود اختیاری گاؤں

گاؤں عملاً خود مختار ہوتے تھے اور جب ایک بار کوئی گاؤں مجموعی طور پر محصول ادا کر دیتا تو مرکزی حکومت سے اس کا بہت کم واسطہ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ حکمران خاندانوں کے بدلنے پر بھی اس پر کوئی مزید بار عائد نہ ہوتا تھا۔ لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے بحرانی دور میں گاؤں میں بھی لڑائیاں جاری ہوگئیں جس کی وجہ سے اِن مصیبتوں کا سامنا کرنا اُن کے لئے ناگزیر ہوگیا بعد ازاں کسی قدر بڑی سیاسی وحدتیں معرض وجود میں آئیں جن کا اثر و نفوذ گاؤں کے بہتیرے مجموعوں پر ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی انفرادی طور پر ہر گاؤں کو داخلی امور میں بڑی حد تک حکومت خود اختیاری حاصل تھی۔ یہاں یہہ امر موجب دلچسپی ہوگا کہ چندرگپت کے زمانے (۳۲۰ ق۔م) میں مردم شماری کا ایک مستقل ادارہ قائم تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور

از۔ اکبر صدیقی

ٹیگور کی ہستی اب کسی ادب میں بھی محتاج تعارف نہیں رہی ہے۔ ایسے ادیب کامل کی تصنیفات پر ذیل کا مختصر سا مضمون کافی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ تاہم کوشش کی جائے گی کہ اس کی شخصیت اور ادبیت کی اصلی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔ شاعر اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:۔

"اس طرح ظاہری طور پر میرا مطالعہ نہ کرو
مجھے بیرونی طور پر تلاش نہ کرو
تم میرے غم اور میری خوشیوں میں مجھ کو نہ پا سکو گے
میرے درد کی تلاش میرے سینے میں کرنے سے کوئی فایدہ نہیں
شاعر وہاں نہیں ہے جہاں تمھاری نگاہیں متلاشی ہیں
تم شاعر کو اس کے سوانح حیات میں نہ پاؤ گے۔"

اس لحاظ سے اگر وہ اپنی سوانح حیات میں نہیں مل سکتا تو وہ اپنی ادبی دنیا میں ضرور نظر آجائے گا۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن ادب میں ذہانت کی خود گم گشتگی، متلاشی کو ہراساں بنا دے گی۔ شاعر کی خود نوشت سوانح عمری سے ہمیں اپنے مقصد میں کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اس کے ابتدائی ستائیس سال کا آئینہ ہے۔ اس سے اس شخصیت کو سمجھنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی جس نے اس کے بعد بھی نصف صدی زیادہ تک ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ ٹیگور کے بچپن کے بہت کم دوست زندہ ہیں جن سے شخصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

وہ ہمارا سب سے بڑا شاعر اور نثر نگار ہے۔ بنگالی ادب کا کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اس نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اور جس موضوع پر اس نے قلم اٹھایا، اپنی جدت پسندی کی بدولت اس میں چار چاند لگا دیئے۔ اس نے کوئی رزمیہ نظم نہیں لکھی۔ ماضی رزمیہ کا دور تھا، اور حال میں اس کا اور رنگ ہے۔

اس کی تصنیفات کا تو کیا ذکر ہے، اگر اس کے موضوعات ہی کو لے لیا جائے تو ابتدا سے اب تک کی فہرست بے انتہا طویل ہو جائے گی۔

شاعر کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر جو خطبہ صدارت ہری پرشاد ام اے۔ ڈی لٹ۔ سی۔ آئی۔ ای آنجہانی نے پڑھا، اس میں انھوں نے لکھا ہے: "اس نے ادب کے تمام موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی، مسدس۔ مختصر اور طویل افسانے۔ ناول اور نثری رومان۔ حزنیہ اور طربیہ ڈرامے۔ گیت اور غنائی اشعار۔ غرض ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر اس نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اور جس پر اس نے قلم اٹھایا اس کے معیار کو بلند کر دیا۔ لیکن موخر الذکر یعنے غنائی شاعری میں اس کو جو کامیابی نصیب ہوئی موجودہ دور میں اس کا عشر عشیر بھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اس کے مضامین ادبی دنیا میں ضیا باری کرتے ہیں۔ اس کی ہجویہ نظمیں دلوں کو برماتی ہیں، وہ قدیم شعرا کا اعلیٰ درجہ مداح ہے اور بنگالی زبان کے سفینہ کا ناخدا۔"

لارڈ ٹینی سن نے اپنی ایک نظم میں وکٹر ہیوگو، کو ان الفاظ سے مخاطب کیا ہے:-

"فرانسیسی ادیب، بلند پایہ ڈراما نگار، رومان نگاری میں مسلم الثبوت رفعت تخیل کا مالک، بیم و رجا کے تانے بانوں سے کھیل کر اپنی قوت انشا کا اظہار کرنے والا۔ انسانی اشک ہائے دردانہ کا مالک اور بچوں کا ماں باپ۔"

یہ اور ایسے ہی کئی خطابات ٹیگور کی جناب میں بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ادبیات ٹیگور کے متعلق پنڈت ہری پرشاد آنجہانی نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو غائر نظر سے مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔ اس نے دینیات، تعلیمات، مدنیات، سیاسیات، تاریخ، لسانیات اور سب سے بڑھ کر موسیقی پر گراں قدر مضامین لکھے۔ وہ مثنوی کا ماہر ہے اور بنگالی زبان کا سب سے بڑا نقاد اور خطوط کی طرز تحریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس کے بعد اس کی ناقابل فراموش یادداشت "عناصر خمسہ" ہے۔ یہ ایک تخیلی ڈراما ہے جس میں اس نے اپنے روزمرہ زندگی کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقصی تمثیلوں کا بھی موجد ہے اور بنگالی زبان کا سب سے بڑا ادیب۔ یہ اس لئے نہیں کہ وہ خداداد ذہانت و ذکاوت کا مالک ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ ایک محقق ہے جس کے مطالعے کا تسلسل کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس کا بنگالی اور سنسکرت ادب کا مطالعہ اور انگریزی ادب پر عبور اور دوسری زبانوں کے انگریزی میں تراجم ہر زبان اور ہر ادب سے اس کو قریب تر کر دیتے ہیں اور اس طرح اس کے مطالعے سے دنیا کا کوئی موضوع نہ بچ سکا۔

ایک غلط فہمی باہر تو باہر بنگال میں بھی ابھی تک چلی آتی ہے کہ ٹیگور کی شہرت نوبل پرائز حاصل کرنے

پہلے نہ تھی۔ پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر یہ ہر طبقے، پیشے اور رتبے کے نمایندوں اور روحانیات، اخلاقیات، مذہبیات اور قوم کے علمبرداروں نے کلکتہ ٹاؤن ہال میں اپنے بنگالی شاعر کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ ایسا ہی ایک اور جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ نوبل پرائز لینے سے پہلے کی باتیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کی شہرت نوبل پرائز کے بعد عالمگیر اور بین الاقوامی ہوگئی۔ اس کی ادبیات کے بہت سے جواہر پارے بنگالی زبان میں ہیں، دوسری مشرقی اور مغربی زبانوں میں منتقل نہیں ہوئے ہیں۔ اس کی کتابوں کے ترجموں اور خاص طور پر ان ترجموں میں جن کا موضوع موسیقی ہے؛ نزاکت خیال، جدت طرازی، بنگالی لفظوں کا انتخاب، بنگالی زبان کے محاورے اصل سے بہت دور جا پہنچے ہیں اور شگفتگی کی جگہ خشکی اور کرختگی نے لے لی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمثیلوں اور نظموں کے وہ تراجم جنہیں خود ٹیگور نے کیا ہے، یکسانیت، سادگی، رفعت وخوبی اور ہر اعتبار سے دوسرے تراجم کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہیں۔ ان تمام واقعات کے باوجود بھی ایک شخص جو ادبیات ٹیگور کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ترجمے کے ساتھ ساتھ اصل زبان میں بھی کتاب کا مطالعہ کرے شخصیت، مذہب انسان وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جنہیں ٹیگور نے دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔

اس کی دعائیں، مناجات، خطبے اور روحانی موضوع کی تمام کتابوں کو ہم اسی ذات مطلق کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اس کے آگے پیش کرتے ہیں جو کائنات کا خالق ہے۔ اس کی مناجاتوں اور خطبوں نے کئی پرستاران روحانیات کو کیف و سرور کی لذت سے ہم آغوش کیا ہے۔ شاعر کی بصارت ذہنی اور تخیل ایک تحریر ہے جس کی قوت سے وہ جہاں چاہتا جاتا ہے اور اپنے پڑھنے والے کو بھی لے جاتا ہے۔ اس کی موجودگی کی وجہ سے بنگالی ادب نے یہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ اس کی تحریروں نے بنگال میں روحانیات کی برقی رو دوڑا دی ہے۔

فلسفے میں وہ کسی نظام کا بانی نہیں، بلکہ وہ اپنے مذہبی فلسفیوں کا مقلد ہے جن کا مذہب اور فلسفہ وحدانیت کی تعلیم دینا، اور "ہمہ اوست" کا درس سکھاتا ہے۔ اس نے پہلی بار مفکر کی حیثیت سے ۱۹۲۵ء میں انڈین فلاسفی کل کانگرس کی کرسئ صدارت کو زینت بخشی اور اپنا فلسفیانہ خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد اس نے فلسفہ ہبرٹ پر تقریریں کیں جو کتابی صورت میں "مذہب انسان" کے نام سے شایع ہوئی ہیں۔ اس کی نثر اور نظم دونوں میں اس کے فلسفے کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس کی موضوع موسیقی کی کتابوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بہ حیثیت ماہر غنا، یا استاد مغنی ہے اگرچہ اس نے ہندوستانی موسیقی کی تعلیم پائی ہے لیکن وہ ماہر مغنی نہیں۔ تاہم اس کے کان، ساز کی

آواز سے اس قدر آشنا ہیں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو دنیاؤں کے درمیان اپنی زندگی گزارتا ہے۔ ایک ظاہری دنیائے رنگ و بو، اور دوسری کو ہم ساز و رنگ منشکل کا نام دے سکتے ہیں۔

ماہرین فن موسیقی نے اس کی ادبیات موسیقی کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور جی کھول کر داد دی ہے۔ یہ صرف اس کی لاتعداد مناجاتوں، وطن کے نغمے اور راگ جس کو خود اس نے ایجاد کیا ہے، اس کی ناہین اور نغمات کے نشیب و فراز جو اس نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں لکھے اور دوسری متعلق موسیقی اشیا کے لئے یہ توصیف نہیں، بلکہ یہ اس لفظ کے متعلق ہے جو اس نے موسیقی پر لکھا۔ وہ صرف نغمات کے لفظوں کا شاعر نہیں جو نہایت بلیغ، بلند پایہ اور جذبہ انگیز ہیں۔ بلکہ وہ نئے سازوں اور پردوں کا بھی آدم ہے۔ اس کی عظمت خاص کر اس کی نغمات نگاری میں پوشیدہ ہے، جس میں شاعر نے موسیقی کی آخری سرحد پر اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اگرچہ اس کی عمر ان بلند پایہ نغمہ نگاروں کے مقابلے میں بہت کم ہے، لیکن اس نے قلیل عرصے میں (۵۰۰) گیت لکھے۔ دس سمفنی، یعنے آرکسٹرائی نغمے لکھے جن میں دو نامکمل ہیں۔ چھ عشائے ربانی کی نغمائی تحریریں ہیں اور پیانو نغمات کی چند چیزیں، اس کی تصنیفات میں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی نغمے ہیں جو آپرا وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" طبع یازدہم میں لکھا ہے کہ سکوبرٹ سب سے بڑا گیت لکھنے والا تھا، اس کے گیتوں کی تعداد (۶۰۰) کے قریب ہے جس میں آپرائی اور ڈرامی نغمات شامل ہیں۔ ایک سرسری اندازہ ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے دو ہزار سے زیادہ گیت لکھے جس کو اس نے سازوں پر جمایا ہے۔ ان کے علاوہ ایسے گیت اور بھی ہیں کہ اس نے مغنیوں اور سازندوں کو لکھ لکھ کر دے دیے اور ان کا اپنے پاس کوئی رکارڈ نہ رکھا۔

شاید پندرہ سال پہلے جب شاعر اعظم نے جرمنی اور زیلو سلافیہ کی سیاحت کی تو اس کے اعزاز میں چند جلسے کئے گئے جہاں اس نے اپنے گیت گائے۔ اس کی طرز نغمہ خوانی اور زبان سے وہاں کی اکثریت ناواقف تھی اور ایسے مقام پر بھی ٹیگور کو بار بار اپنے گیت دہراتے رہنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس کو پڑھتے، خطبات دیتے یا فی البدیہ تقریریں کرتے ہوئے یا بنگالی مناجات پڑھتے ہوئے سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی آواز کتنی ترنم خیز اور وجد آفریں ہے۔ اسی طرح اس کی تقریریں اکثر اس کی زبان کی روانی کا شکار رہا کیں، اور اس کے جلسے ایسے عشرت آگیں رہے جس سے اخبار کے نمایندوں کو بارہا مایوس ہونا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ گفتگو کا بھی اسطرا ہر ہے۔

وہ ایک ماہر استاد اور ادا آموز ہے۔ جن لوگوں نے اس کی اداکاری کے کمالات دیکھے ہیں

وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے تمثیلی حصوں کو کتنی کامیابی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے حصے کا لحاظ کرتے
ہوئے خصوصاً وہ لیڈر ہی بن جاتا ہے۔ آغاز شباب سے وہ اپنی نظمیں، مکالمے، افسانے، ڈرامے،
ناول اور منتخب مضامین سنایا کرتا، اور ایسے موقعوں پر بھی اس کی اداکاری کا وہی عالم رہتا گویا وہ اسٹیج پر ہو

اگر یہ صحیح ہے کہ موسیقی کی تجدید حیات اور پبلک میں اس کا ذوق پیدا کرنے کے لئے برہمو سماج کا
بہت بڑا حصہ ہے تو اس کی کامیابی کا سہرا زیادہ تر ٹیگور، اور اس کے خاندان کے سر رہے گا۔ اسی نے
اداکاری کے فن کو معزز طبقے کی لڑکیوں اور عورتوں میں مقبول بنایا۔ شاعر نے رقص کے فن کو
بنگالی لڑکیوں اور عورتوں میں بہ حیثیت تفریح و تفنن طبع امتیازی جگہ دی، نئے طریق رقص جو اس نے
ایجاد کئے اور جنہیں شخصی طور پر شانتی نکیتان کی طالب علم لڑکیوں کو سکھایا ہے۔ عیش و عشرت،
بدنمائی، نیم عریانی یا غیر معیاری رقص سے کوسوں دور ہیں۔ ٹیگور کے وطنی گیت خاص حیثیت رکھتے ہیں۔
یہ نہایت شستہ اور پاکیزہ ہیں، ان میں بے سرا پن، تمکنت اور مبالغے کا شائبہ بھی نہیں۔ ان میں سے
چند ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور چند مادر وطن کو ہمارے روح کی گہرائی میں عزت کا
تاج پہناتے ہیں۔ چند گیت ہماری پس پردہ روح کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور ہماری دنیا امیدوں سے
مالا مال ہو جاتی ہے۔ چند گیت ہمیں عالی ہمتی اور اولوالعزمی کا درس دیتے ہیں لیکن کسی میں ہماری
دلچسپیوں کا فقدان نظر نہیں آتا۔ مایوس کن جذبات اور ما قبل تاریخ کی کوششوں کا بھی اس میں
نام نہیں۔ ان میں بہت سے گیت بنگال میں سودیشی تحریک کے موقعے پر لکھے گئے ہیں اس شاعر نے
تیس سال قبل کی چیزوں اور واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ تصویر اس کی دوسری تحریروں میں
نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ”کتھا او کہی نی“ کے گیتوں میں جو ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں اثر کر ہیجان پیدا کر دیتے ہیں
اور ہمارا خون رگوں میں جوش کھاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے! اس کے اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔
بہرکیف غنائی شاعری میں اس کا درجہ بہت بلند ہے گیت اور نغمے قوم کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ
لیتے ہیں۔ ٹیگور کے گیت اور نغمے جن میں اس کے ابتدائی حصے کی بہ نسبت آخری حصے کے زیادہ ہے۔
بنگال اور اس کے مہذب اور غیر مہذب شہری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے نغموں ہی سے سودیشی تحریک میں حصہ نہیں لیا بلکہ معاشرتی
اور سیاسی جلسے جو اس کے زیر صدارت ہوتے تھے، اس کی قومی خدمات کا ایک جز ہیں۔ اس نے اپنے
وقت کا بہت بڑا حصہ اپنے ملک میں مختلف صنعتوں کو رواج دینے، ہندوستان میں تعلیم پھیلانے
اور وسیع معنوں میں ہندوستانیوں کو انسان بنانے اور دیہات کے حفظان صحت کا انتظام اور

ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑانے کے لئے صرف کیا ہے۔ اس کی عدم مداخلت کی تعمیری اسکیم یا بالفاظ دیگر تعمیری خود اعتباری، دیہاتی صنعتوں کی تجدید اور دیہات سدھار وغیرہ کا کام جو اس سودیشی تحریک کے زمانے میں آج سے پینتیس سال پہلے کی تحریروں اور خطبات میں آیا ۱۹۰۴ء میں جو لکچر "سُودیسی سماج" پر دیا گیا، اور بنگال کی صوبہ وارتی کانفرنس منعقدہ پبنا ۱۹۰۸ء کا صدارتی خطبہ اس کی مثالیں ہیں۔ "ٹیکس نہ لگاؤ" کی تحریک اس کی تمثیلوں مثلاً "کفارہ" اور "رہائی" میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ تمثیل کا ہیرو دھنن جایا بیراگی ہے جو نہایت خندہ پیشانی سے مصائب و آلام کا استقبال کرتا ہے۔ اس کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ رہبر اور ... کی قوم کا ایسے موقعوں پر کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ دونوں تمثیلیں ڈرامائی انداز میں تحریر ہوئی ہیں۔ ایک تاریخی رومان "ملکہ عروس کا بازار" ہے جو ۱۸۸۴ء میں شایع ہوئی۔ ان تمثیلوں میں "پریا شنا" ابتدائی تصانیف میں سے ہے جو ۱۹۰۹ء میں شایع ہوئی۔ اس کے جستہ جستہ آزاد ترجمے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:—

(دھنن جایا بیراگی اور چند دیہاتی بادشاہ کے پاس جاتے ہیں)

تیسرا دیہاتی — باپ! ہم بادشاہ سے کیا کہیں گے؟

دھنن جایا بیراگی — ہم کہیں گے کہ ہم محصول ادا نہیں کرتے

تیسرا دیہاتی — اگر وہ اس کا سبب پوچھے تو؟

دھنن جایا — ہم کہیں گے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر ان کے رونے دھونے کو نہ دیکھ کر تمہیں روپیہ پیسہ دیں تو ہمارے خدا کو تکلیف ہوگی۔ غذا جس پر زندگی کا انحصار ہے ایک مقدس عطیہ ہے جس کا انتساب خدا سے ہے، کیونکہ وہ زندگی کا خدا ہے۔ جب ضرورت سے زیادہ دولت ہمارے پاس رہ جائے تو اے بادشاہ ہم اسے تیرے چرنوں میں ڈالیں گے۔ مگر ہم اپنے خدا سے چھین کر یا خدا کو دھوکہ دے کر تجھے محصول نہیں دے سکتے۔

دھنن جایا — اس کو سنایا تو جا سکتا ہے کیا خدا اس کو حق بات سننے کی راہ نہیں دکھائیگا؟ کیا وہ اتنا بدقسمت ہے۔ ہم اس کو سننے پر مجبور کریں گے۔

پانچواں دیہاتی — مقدس باپ! اس کو فتح ہوگی، کیونکہ اس کی قوت ہمارے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہے۔

دھنن جایا — دور ہو جاؤ میری نظروں سے! بیوقوف! کیا تم سمجھتے ہو کہ مغلوب میں قوت نہیں!

چھٹا دیہاتی — لیکن باپ! ہم بادشاہ سے بہت دور تھے اور روپوش ہو کر اپنی جانیں بچا سکتے تھے لیکن

اب اس کے دربار سے بالکل قریب ہیں۔ اگر کوئی مصیبت بڑھائی جائے تو سر چھپانے کو کہیں جگہ نہیں۔

غرض وہ بادشاہ کے پاس جاتے ہیں محصول نہ ادا کرنے کی ترغیب دینے پر بیراگی قید کر لیا جاتا ہے جس سے اراکین سلطنت، حتیٰ کہ ولی عہد سلطنت تک باپ کا مخالف ہو جاتا ہے۔ اتفاقاً قید خانے میں آگ لگتی ہے اور بیراگی وہاں سے جان بچا کر خود بخود بادشاہ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے:-

دھنن جایا۔ مہاراج۔ آگ نے مجھے رہائی کا حکم سنا دیا لیکن میں دربار والا میں اطلاع دیے بغیر کیسے باہر جا سکتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے!

بادشاہ۔ کیا تم قید خانے میں خوش تھے؟

دھنن جایا۔ بے حد خوش۔ مجھے وہاں کوئی فکر نہ تھی۔ یہ تمام اسی ذات واحد کی مہربانیاں ہیں۔ اس نے سمجھا کہ میں مقید ہونے کے بعد اس کو نہ پا سکوں گا، لیکن میں نے پا لیا۔ میں نے اس کو فرط انبساط میں اپنے سینے سے لگایا اور اس کے بعد میرے ابتہاج و مسرت کی کوئی انتہا نہیں۔ میں اپنے رفیق قید خانے کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھوں گا!

بادشاہ۔۔ بیراگی! تم کیا کہتے ہو!! تم قید خانے میں اتنے خوش کیسے رہے؟

دھنن جایا۔ مہاراج! جیسے مسرت آگئیں مجھے آپ کی سلطنت میں ہیں ایسے ہی میرے لئے قید خانے میں۔ وہاں کس بات کی کمی تھی۔ ذات پاک اگر آپ کو آزاد فضا میں مسرت بخش سکتی ہے تو کیا مقید فضا میں مسرت کی جھلکیاں دکھلانا اس سے ناممکن نہیں!

بادشاہ۔ اچھا! اب تم کہاں جاؤ گے؟

دھنن جایا۔ سڑک پر

بادشاہ۔ مجھے اکثر اس بات کا خیال آیا ہے کہ تمہارا راستہ میرے راستے پر قابل ترجیح ہے۔ میری سلطنت ہیچ ہے۔

دھنن جایا۔ مہاراج! سلطنت بھی ایک راستہ ہی ہے لیکن سیدھی راہ جائے یا راستہ بھٹکے۔ چلنے والے کی مرضی۔ جو راستہ جانتا ہے وہی حقیقتاً راہرو ہے۔ ہم سنیاسی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں، اب اگر آپ اجازت دیں تو رخصت ہوتا ہوں۔

بادشاہ۔ لیکن مادھب پور نہ جانا۔

دھنن جایا۔ میں کیسے وعدہ کر سکتا ہوں۔ اگر خدا لے جائے تو کون مانع ہو سکے گا۔

ان دو تمثیلوں میں ہیرو کا نام دھنن جایا ہے جس کے معنے ہیں دنیاوی دولت کا فاتح۔ شاعر کا تخیل خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عوام کا رہبر ہونے کا اہل ہے۔

شاعر نے اپنی کتاب "قومیت" میں قومیت کی یہ تعریف کی ہے :۔ "قومیت عوام کے منظم ہونے کا نام ہے اور جو عبارت ہے خود غرضانہ اخراجات کا بارِ غیر اقوام پر ڈالنے سے جو جبر و تعدی سے وصول کئے جاتے ہیں اور چونکہ وہ ان خیالات کا حامل ہے اس لئے اس کو بین الاقوامیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔" اس کی مادرِ وطن سے محبت جس کا اظہار اس نے الفاظ اور عمل کے ذریعے کیا ہے ممکن ہے کہ سطح بیں نظروں کے لئے شاید لایعنی معلوم ہو لیکن عوام اس کے عمل اور اس کے ادبی خدمات سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی مادرِ وطن سے ایسی محبت کرتا ہے :۔

جو داستانہائے ماضی سے حاصل کی گئی ہے
اور اس محبت کا اظہار دورِ حاضر میں کیا گیا
لیکن یہ مستقبل میں رفعتِ تخیل کی وجہ سے بدل جائے گی۔

تاریخ ہند اور قدیم تاریخ میں اس کا گہرا مطالعہ اور اس کی نکتہ رس نگاہوں نے اس کی محبت کو گرما دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک مضمون "تاریخ ہند" خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

اس کی بین الاقوامیت کی اصلیت کا خاکہ سودیشی تحریک کے مایوس کن تجربات میں ملتا ہے جو اس صدی کی پہلی ناکام تحریک ہے۔ ایسے تجربات سے کبھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا حب خلق اور ان کے معاملات میں دلچسپیوں کا خاکہ اس کے بچپن کی تحریروں میں جب کہ وہ ابھی اپنے بیس سال بھی پورے نہیں کر سکا تھا، نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے اس کردار کا خاکہ اس کی ایک نظم "پردیسی" میں شدت کے ساتھ صاف طور پر نظر آتا ہے جو آج سے چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی جس کی ابتدائی سطریں اعلان کرتی ہیں کہ اس سنسار کا ہر مقام اسی کا ہے، ہر گاؤں اس کا وطن ہے۔ ہر گھر میں اس کے عزیز و اقارب ہیں، وہ اسی وطن اور انھیں عزیز و اقربا کے دلوں میں گھر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حب وطن میں تنگی نظر، قومی جوش یا نفرت و حسد کا کہیں شائبہ بھی نہیں اس کو یقین ہے کہ ہندوستان کا ایک پیام ہے ایک مقصد کا ہے ایک خاص کام ہے جس کو ہندوستان کے سپرد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"اختلاف میں اتحاد کا احساس اور تغیر میں ارتباط کا قیام ہندوستان کا سناتن دھرم ہے۔

ہندوستان اختلافات کی اجازت نہیں دیتا۔اس لئے وہ کسی سے تعرض نہیں کرتا اور نہ کسی کو مٹاتا ہے۔ وہ کسی طریقے سے دست بردار نہیں ہوتا۔ وہ مقاصد کی عظمت جانتا ہے اور ان تمام مقاصد کو ایک لڑی میں پرو دینا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد وہ کہتا ہے: "تاریخ ہند کے بلحاظ ہیں جو مقصد کام کر رہا ہے وہ ہندو یا کسی اور مذہب کی بالکلیہ عظمت نہیں ہے۔ ہندوستان دنیا انسانیت کی تاریخ ایک خاص مقصد کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوئی خاص شکل تلاش کر رہی ہے جو کل انسانوں کے لئے مہیا ہو گی اس سے زیادہ اس کا دینی و مذہبی نہیں اس مقصد کی تخلیق کے لئے اگر ہندو مسلمان یا عیسائی اپنے شخصی جنگجویانہ قوتوں کو دبا دیں گے تو یہ ان کے قومی وقار کو تو صدمہ پہنچائے گا لیکن سچائی اور حق کے لئے کیسی قسم کا نقصان تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

ٹیگور کا آئیڈیل وہی ہے جو رام موہن رائے کا تھا۔ رام موہن رائے کا بیان تھا کہ جو شخص ہندوستان کی مشکلات کے حل کرنے میں مدد نہیں کرتا اور انھیں دبانے نہیں دیتا ہے۔ وہ ان کو وقت اور دنیا اصل کی آزادی میں لے جاتا ہے اور مشرق و مغرب کے اتصال کے لئے ایک پل تعمیر کرتا ہے۔ ہندوستان کے آئیڈیل کا یہ تصور ... رام جو ڈے نے اپنی کتاب "ہندوستانی تہذیب" میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"یہ ایک بدیہی واقعہ ہے کہ ہندوستان کا ایک خاص تحفۂ انسانیت کو پیش کیا گیا ہے وہ ہندوستانیوں کی قابلیت ہے جو مختلف عناصر کے اتحاد سے خیالات اور عوام دونوں کو متاثر کر سکتی ہے جس سے اتحاد کا پیدا ہونا یقینی ہے۔"

شاعر کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ دوسرے ممالک بھی اپنا ایک مطمح نظر اور لائحہ عمل رکھتے ہیں۔ وہ مغرب سے علٰحدہ نہیں ہے بلکہ وہ اس کی تحقیقات، علمی ترقی اور تلاش حق کے ذوق، آزادی، انصاف (جس کا اب گمان بھی نہیں کیا جا سکتا) اعتراف انسانیت (جو اب بالکل ناپید ہو چکی ہے) اور بہبودی بنی نوع انسان کے لئے اس نے جو جہد کی ہے ان تمام کی قدر کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مشرق و مغرب کی ان چیزوں کو حاصل کرے جو اس کو اپنے مفاد کے لئے ضروری ہیں لیکن اس طرح نہیں جیسے ایک بھکاری یا ایک بچہ حاصل کرتا ہے بلکہ طاقتور اور تندرست انسان کی طرح جو اپنی غذا آپ فراہم کر لیتا ہے۔ مغرب سے مشرق کی یہ تحصیل مزید برآں تحریکوں وغیرہ کی تفصیل نقالی سے بدرجہا بڑھی ہوئی رہے گی۔ مغرب اسی طرح مشرق سے اپنے مفاد کی خاطر جو چاہے لے سکتا ہے لیکن یہ بھی مادی مفاد سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس کی تحریروں اور خطبات سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ مشرق پر مغربی حکومت باقی نہیں رہے گی، بشرطیکہ اول الذکر بیدار ہو جائے خودداری اور اپنی عزت آپ کرنے کو اپنا شعار بنائے۔ اب اس کو کسی تازیانے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور زندگی کے کسی شعبے کو اس نے نہیں چھوڑا۔

شاعر کا ہاتھ مشرق و مغرب دونوں تک پہنچتا ہے اور اس کی رسائی تمام بنی نوع انسان تک ہے۔ وہ اپنی ادبی خدمات اور اپنی سیاحی کی بدولت وہ قوموں اور ملکوں میں اتحاد پیدا کرنے والا ہے اور اس طرح اس نے جاپان، چین، سیام، ہندوستانی جزائر، ایران اور عراق کے مابین معاشرتی اتحاد پیدا کیا ہے۔

یہی وہ شخص تھا جس نے جلیان والا باغ کے قتل کی مذمت کی اور احتجاجاً اپنا "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔

ہندوستان میں اس کی سیاسی سرگرمیاں نمائشی نہیں، بلکہ وہ ہمارے معاشرہ اور کردار کی تعمیر کا بہت بڑا جز ہیں۔ آزادی کو دوسرے سیاست والوں کی طرح گوہر نایاب سمجھتا ہے لیکن اس کی آزادی کا تخیل بنیادی اور مکمل ہے۔ وہ کاہلی، بزدلی، جہالت، خود غرضی، عیش و عشرت، توہمات، بے جان رسومات، مذہبی پیشواؤں کے بے جا اختیارات کو اجنبی کی غلامی سے زیادہ سمجھتا ہے اور مذکورہ بالا تمام چیزیں ہندوستان پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی ہیں۔ وہ بیرونی پابندیوں کے اٹھا دینے پر مصر ہے لیکن یہی اس کی آزادی کا منتہا نہیں۔ اس میں اندرونی آزادی بھی ضروری ہے جو ایثار، قربانی، روشن خیالی اور اپنے قلوب کی صفائی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اس نظریے نے ہندوستانی سیاسی مسئلے کے تصور کو سانچے میں ڈھال دیا ہے اور اس کو ترقی دینے کا یہی ایک بہتر طریقہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ روح بھی آزادی حاصل کرے تاکہ اس میں قوت پرواز پیدا ہو جس سے وسعت نظر کے پیدا ہونے کا امکان ہے اور پھر اس کی سرگرمیوں کے لئے لامحدود میدان پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خوف کو بالکل مٹا دے اور اس طرح اس کی سیاسی اور روحانی خدمات ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔

اس کی روح نئی روشنی حاصل کر کے اس کو منعکس کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ وہ ہمارا ایسا معاشرتی مصلح ہے جو ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کی ذہنی قوتیں اب بھی مائل بہ پرواز ہیں۔ وہ ہمارا سب سے زیادہ سرگرم مصنف ہے یہی اس کی تخلیق، قوت اظہار اور برادرانہ تعلقات کی دلچسپیاں سامیں جو وہ اپنے ہم جنسوں سے محبت کرتا ہے اور وہ مبحث جس کا موضوع انسان ہے اس کی روح کو تسکین پہنچاتا ہے۔ اس کا مختلف موضوعات پر لامتناہی مطالعہ جس میں زمانے سے ناموافق موضوعات بھی شامل ہیں اور اس کی پر اثر نظموں کی سیاحی نے اس کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے معاصرین سے ذہنی اور روحانی تعلقات اور ان کی رفتار کے ساتھ اپنی رفتار کو بھی قائم رکھے۔

شاعر کا دل بنی نوع انسان کے بے حد متاثر ہے اس نے کئی نظموں میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس کے شاہکار "گیتانجلی" سے پیش کی جاتی ہیں :-

"تیری گذرگاہوں پر جہاں تو ادنیٰ اور غریب لوگوں میں انہیں کا بھیس لئے پھرتا ہے
تکبر و نخوت کی پرچھائیاں بھی نہیں پڑ سکتیں"
جہاں تو بے کسوں بے بسوں اور تنہاؤں کا ساتھی ہے
میرا دل کبھی اس کا راستہ بھی نہیں پا سکتا"

"وہ ذات واحد وہاں ہے جہاں کسان سخت زمین میں ہل چلاتا ہے اور جہاں راستہ صاف کرنے والے پتھر چنتے ہیں۔ وہ گرمی اور سردی میں ان کا ساتھی ہے اور اس کا لباس گرد آلود ہے۔ اے انسان تو اپنا خرقہ سالوس اتار پھینک اور قدوس کی طرح گرد سے آئی ہوئی زمین پر آجا۔" "مادر وطن"

تیس سال پہلے اس نے ایک نظم لکھی تھی، یہ نظم "گیتانجلی" میں شامل ہے جس میں اچھوت اقوام کے ساتھ برتاؤ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"میرے بدنصیب ملک! وہ لوگ جس کی تو نے تحقیر کی ہے، ان کی پستی میں بھی تجھے ان کو مساوات کا درجہ دینا چاہئے، اور ان لوگوں کو جن کے انسانی حقوق تو نے غصب کر لئے ہیں اور انہیں اپنے سامنے منتظر کھڑا کر دیا، اور اپنے دامن میں جگہ نہ دی۔ تجھے اپنی خفت میں مساوات کا درجہ دینا چاہئے۔"

شاعر کے نسوانی تعصب العین نے تخلیق "چترا" اس طرح شروع ہوتی ہے :-

"میں چترا ہوں، میں کوئی دیوی نہیں جس کی پوجا کی جائے۔ اور نہ اتنی حقیر ہوں کہ مجھے اس طرح دور کیا جائے جیسے ایک پتنگا لاپروائی کے ساتھ دور کر دیا جاتا ہے۔ اگر تم خطرناک مواقع پہ مجھے برابری کے ساتھ کام کرنے کا موقع دو، اگر تم اپنے فرائض کی ادائی میں مجھے بھی حصہ لینے دو تو تم میری حقیقت کو پہچان سکو گے۔"

یہ الفاظ ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس مکمل خیال کو حاصل کرنے کے لئے کہ وہ عورت کو کیا سمجھتا ہے اس کی دوسری کئی نظمیں اور تحریریں پڑھنی چاہئے۔ نظموں میں "شہ زور عورت" اور "کمزور عورت" قابل مطالعہ ہیں۔

ہماری خوش قسمت بہنیں جنہیں شکست خوردہ عورت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اگرچہ ان کے ساتھ دغا کرنے اور انہیں لوٹ لینے والے شکست خوردہ مرد نہیں ہیں اس کے لئے "کاہنی" میں شکست خوردہ عورت اور "درد" اور "جیتانی" میں عصمت مآب عورت پڑھئے۔ موخرالذکر دو نظمیں ابھی انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئی ہیں۔

بہر حال یہ ہے ہمارا وہ ادیب جس نے ادبی دنیا میں اپنی جگہ بہت بلند سطح پر حاصل کرنی ہے۔

گولکنڈے پر مغلوں کے حملے

سولھویں صدی عیسوی میں قطب شاہی سلطنت عروج پر تھی۔ قبل اس کے کہ مغل حملہ آور ہوں اس سلطنت کو ایک ایسی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا جس سے سلامت نکلنے کے بعد اس میں اسقدر سکت باقی نہ رہی کہ وہ مغلوں کی یورش کے مدمقابل ہو سکے۔ اگر صرف مغلوں ہی کا سامنا ہوتا تو پھر بھی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن بیک وقت گولکنڈے پر جو غداروں کے بادل ٹوٹ پڑے وہ ناقابل برداشت تھے۔ ایک ہی وقت میں ان دو چیزوں کا مقابلہ زبردست سے زبردست سلطنت کے امکان سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گولکنڈے نے حتی الامکان مغلوں سے معرکہ آرائی سے پہلوتہی کی اور بڑے بڑے تاوان اور پیشکش دینے قبول کئے۔ اور جب ان چیزوں سے مغلوں کو روکنا مشکل ہو گیا تو مجبوراً گولکنڈے نے ہتھیار سنبھالے۔ اور شکست اُٹھائی۔ پہلے ہم اُس سیاسی کشمکش کا ذکر کرتے ہیں جس کا سلطنت قطب شاہی کو سامنا کرنا پڑا اور جو قطب شاہی سلطنت کی بڑی کمزوری کا باعث تھی۔

گولکنڈہ کی ہمسایہ اور رقیب سلطنت وجیانگر کی دست درازیوں اور اسکی طرف سے توہین نے شمالی دکن کے منتشر بادشاہوں اور حکومتوں کو خطرہ سے آگاہی دی۔ اگر رام راج والی وجیانگر کی یہی رفتار رہی تو یہ شمالی حکومتیں اس کا لقمہ بنجائینگی اور پھر فتح و نصرت کے نشہ میں مذہبی تعصب کی کارگزاریاں ناقابل برداشت ہو جائینگی۔ اس موقع پر دو شخص کشور خاں اور مصطفےٰ خاں کے نام لئے جاتے ہیں جنھوں نے دکن کی اسلامی سلطنتوں میں اتحاد و یگانگت کے بندھنوں کو قائم کیا۔ علی عادل نے ابراہیم قطب شاہ کے پاس کشور خاں کے ذریعہ اتحاد کی دعوت بھیجی۔ ابراہیم نے اس پیشکش کی قدر کرتے ہوئے خود واسطہ بنکر مصطفےٰ خاں کے ذریعہ بیجاپور اور احمدنگر میں بھی اتفاق کرادیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی نامور اور

یگانۂ روزگار بیٹی سلطانہ چاند بی بی کو عادل شاہ کے نکاح میں دیا اور نزاعی علاقہ جات چاند سلطانہ کا جہیز قرار پائے۔

وجیانگر کی کثیر تعداد فوج اور رام راج کی دست درازیوں سے اسلامی سلطنتیں خائف تھیں۔ اس اتحاد کے بعد وجیانگر سے جنگ شروع کردی گئی۔ اور اسلامی سلطنتوں کے والیوں نے متحدہ طور پر بہ ذات خود وجیانگر پر فوج کشی کرکے اس سلطنت کا خاتمہ کردیا۔

اس فتح سے اسلامی سلطنتوں کو یک گونہ اطمینان ہوگیا۔ گولکنڈے اور بیجاپور نے رفتہ رفتہ حملے کرکے سلطنت کو کافی وسعت دے لی۔ ابراہیم قطب شاہ نے خود کرناٹک پر حملے کئے۔ اور اس پر قبضہ کرکے اپنی دولت میں کافی اضافہ کیا۔ گولکنڈے کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مشرقی علاقوں پر گولکنڈے کا دوبارہ تسلط ہوگیا۔ مشرقی تلنگانہ میں نایکوں کو مغلوب کرنا آسان ہوگیا۔ ۱۵۷۱ء میں راج مندری فتح کرلیا گیا جو نایکوں کا مستقر بن گیا تھا۔ ۱۵۷۹ء میں اس اطلاع پر کہ اکثر نایکوں نے راج مندری سے نکل کر قاسم کوٹہ میں پناہ لی ہے وہاں حملہ کرکے اسکو بھی فتح کرلیا گیا۔

ان تمام فتوحات کے بعد گولکنڈے کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ حدود سلطنت جنوب میں شمالی کرناٹک تک مشرق میں اڈیسہ، مغرب میں کوکن تک وسیع ہوگئے۔ گویا اسوقت سارا تلنگانہ قطب شاہوں کے زیر نگیں تھا۔

قطب شاہی سلطنت کا عروج ۱۵۸۰ء میں شروع ہوا جبکہ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ " جمیع صفات صوری ومعنوی سے ممتاز تھا " اس کا ثبوت قطب شاہی سلطنت کا عروج ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ حرص وہوس کی آگ پھیلی ہوئی تھی۔ علی عادل شاہ نے احمد نگر کو اپنی سلطنت میں داخل کرلینا چاہا۔ لیکن دکن میں طاقتوں کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے گولکنڈے کو احمد نگر کی حمایت کرنی پڑی۔ کیونکہ احمد نگر کی فتح کے بعد علی عادل کی قوت بہت بڑھجاتی تھی۔ اس اعانت سے خائف ہوکر صلح کرلی گئی۔ لیکن اب براہ راست گولکنڈے پر حملے کی ساز باز ہونے لگی۔ علی عادل نے احمد نگر کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ کرلیا۔ اور برار کا لالچ دیکر متحدہ فوجوں کو برار کی جانب لے گیا۔ تحفہ تحائف سے یہ بلا برار سے ٹل گئی۔ لیکن ایکی دفعہ اتحادیوں نے قطب شاہی سلطنت کے جنوبی حصہ پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن راستے میں اتحادیوں میں پھوٹ پڑگئی۔ اور یہ خیال خواب بنکر رہ گیا۔

اس کے بعد گولکنڈے نے پھر کوشش کی کہ احمد نگر اور گولکنڈے کا اعتماد قائم رہے اس لئے احمد نگر کو

علی عادل کے خطرناک ارادوں سے آگاہ کیا گیا۔ اور بیجاپور و احمدنگر اتحاد ختم ہوکر دوبارہ احمدنگر اور گولکنڈے کا اتحاد قائم ہوگیا۔ اس اتحاد میں وجیانگر کے والی رام راج کے بھائی (جسکو اتحادیوں نے تھوڑے سے علاقہ پر راجہ بناکر بٹھادیا تھا) کو شریک کرنیکی کوشش کی گئی۔ لیکن احمدنگر کے نا جائز مطالبات سے یہ اتحاد قائم نہ ہوسکا۔ اور جب یہ فوجیں اپنے ملکوں کو واپس ہونے لگیں تو راستہ میں عادل شاہی فوجیں مزاحم ہوئیں۔ اس سے احمدنگر کی فوج پریشان ہوگئی اور راستہ کاٹ کر قطب شاہی حدود سلطنت میں سے گذرنے لگیں۔ یہ صرف یہی بلکہ گذرتے وقت لوٹ مار شروع کردی اس سے کشیدگی میں اضافہ ہوا۔

اس کشمکش کا نتیجہ احمدنگر کے حق میں مضر ہوا۔ اس کی مرکزی حکومت کمزور ہوگئی تھی، نیز گولکنڈے سے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ یہ علی عادل کی حرص وہوس کے لئے اچھا موقع تھا۔ ۱۵۶۴ء میں حملہ کیا گیا۔ بعض علاقے فتح ہوگئے۔ لیکن احمدنگر کے مشہور وزیر چنگیز خاں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حملہ آور فوج کے سردار کشور خاں لاری کو قتل کردیا۔ لیکن بعد میں تازہ مدد پہنچ گئی جسکی وجہ سے احمدنگر میں بے چینی پھیل گئی۔ اور سوائے گولکنڈے سے امداد کی درخواست کرنے کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ اس وقت ابراہیم قطب شاہ کی قوت راج مندری اور قاسم کوٹہ کے فتح ہوجانے سے بہت بڑھ گئی تھی اور اس جنگ وجدال کے بعد وہ امن کا خواہاں تھا۔ اس لئے اس نے اس مداخلت کی دعوت کو قبول کرلیا۔ اسکے علاوہ سلطنت بیجاپور کے والی علی عادل کو سبق دینا بھی منظور تھا اب گولکنڈے اور احمدنگر کی فوجیں متحدہ طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئیں۔

علی عادل سخت پریشان ہوگیا۔ وہ اس شبہ میں کہ اس کا پیشوا ابوالحسن اس اتحاد کا بانی ہے اس کو گرفتار کرلیا۔ لیکن اکثر لوگ ابوالحسن کے طرفدار تھے ان میں سے ایک سید مرتضیٰ تھا جو پہلے مرتضیٰ نظام شاہ کا ملازم تھا اور بعد میں علی عادل کی ملازمت اختیار کرچکا تھا۔ اس نے مرتضیٰ نظام سے صلح کی درخواست کی اور ابوالحسن کی رہائی پر صلح ہوگئی۔ اس سے اس نئے اتحاد کو دوبارہ سخت صدمہ پہنچا۔ علی عادل نے سید مرتضیٰ کے ذریعہ مرتضیٰ نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ میں پھوٹ ڈال دی اور اس سے ابراہیم متاثر ہوکر بیدر ہوتے ہوئے گولکنڈہ آگیا۔

ابراہیم نے اب بجائے بیجاپور کے احمدنگر کو پریشان کرنے کی ٹھانی۔ اس کے لئے نیا اتحاد قایم کیا گیا۔ والی بیدر اور والئی برار اس میں شریک کئے گئے۔ علی عادل کو بھی دعوت دی گئی۔ لیکن عین موقع پر اس نے احمدنگر کی چپکے سے امداد کردی۔ اسلئے یہ فوجیں پھر واپس ہونے لگیں۔ علی عادل اور مرتضیٰ نظام نے ملکر تلنگانہ پر حملہ کردیا۔ گولکنڈے کی فوجوں نے مدافعت کی اور دشمن کو عظیم نقصان کے ساتھ پسپا کردیا۔ حملہ آور نے اس اندیشے سے کہ ابراہیم احمدنگر اور بیجاپور پر حملہ کردے کولاس کی سرحد پر فوج متعین کردی۔ اس فوج نے قطب شاہی حدود سلطنت میں اودھم مچادی۔ اسکی مدافعت کے لئے سخت جنگ ہوی اور دشمن کو نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اسی دوران میں

مرتضیٰ نظام نے برار فتح کر لیا تھا۔ اور اب بیدر پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن اب اس کو گولکنڈے کی امداد کی ضرورت محسوس ہوی پیہم عہد شکنیوں کے باوجود گولکنڈے نے دستِ تعاون دراز کیا۔ اور فوجی امداد بھیجی۔ لیکن علی عادل اسوقت بیکار نہ بیٹھا اور بیدر کو امداد پہنچادی۔ اس لئے حملہ آور ناکام لوٹنے پر مجبور ہوگئے۔

تاریخ عالم میں شاہان ولوالعزم کی موت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مخفی نہیں ہے علی عادل شاہ اول کے انتقال کی وجہ سے ۱۵۸۰ء میں دکن کی سیاست کا نقشہ بدلنے والا تھا۔ علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا علی عادل شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یہ صلح کل مسلک کا حامی تھا۔ گو ابتدا میں اپنے چچا کی پالیسی پر عمل کرتا رہا۔ علی عادل اول نے علی برید کی مدد کی تھی۔ اسلئے احمدنگر میں رقابت کا جذبہ ناواجبی تھا۔ اس سے آگاہ ہوکر علی عادل ثانی نے احمدنگر پر حملہ کردیا۔ شاہ درگ پر لڑائی میں احمدنگر کے سردار بہزاد الملک کو شکست ہوی۔ کیونکہ اس نے جلدی کرکے بیجاپور پر دھاوا بول دیا۔ اور بیدر کا محاصرہ کر لیا۔ شکست کے وقت ہی گولکنڈے کی امدادی فوج امیر شاہ میر کی سرکردگی میں پہنچ گئی۔ اور نلدرگ کا محاصرہ ہوگیا۔ اس کشمکش میں مرتضیٰ کو بہت نقصان ہوا۔ عادل شاہیوں کو شکست ہوئی اور بجائے محصور فوج کو مغلوب کرنے کے حملہ آور عجلت کے ساتھ بیجاپور پہنچ گئے۔ کیونکہ محصور فوج بہت محفوظ تھی۔ اس غلطی سے محصور فوج بھی مرکزی حکومت کی مدافعت کے لئے پہنچ گئی۔ اس دوران میں گولکنڈے کی دوسری فوجیں چپ نہ رہیں بلکہ ان فوجوں نے بیجاپور کے مقبوضات کاولی، کاکنی اور کلکور مسخر کرلئے۔ ان متواتر شکستوں سے بیجاپوری فوج پریشان ہوگئی تھی لیکن قطب شاہی سپہ سالاروں کی نااتفاقی اور پھر بیجاپور کے فریبوں سے معاملہ خراب ہوگیا۔ حملہ آوروں کو بیجاپور چھوڑنا پڑا اور نلدرگ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ محاصرے کی سختی کے مدنظر بادشاہ سے درخواست کی گئی کہ وہ خود محاصرے کے لئے آئے۔ لیکن عین اسوقت ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اور محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔

اس خبر کو محاصرے کے کیمپ میں پوشیدہ رکھکر تمام سرداروں نے اپنے نصب العین کی کامیابی کا تہیہ کیا اور قسمیں کھائیں ساتھ ہی نوجوان بادشاہ نے بھی اپنے باپ کے مسلک کو نبھائے رکھا۔ نظام شاہ کی جانب سے باپ شاہ کے انتقال کی تعزیت کے لئے سفیر آئے اور اتحاد کی دعوت دی گئی جسکو محمد قلی نے قبول کیا۔ امیر شاہ میر نے گولکنڈے آکر بادشاہ سلامت سے نلدرگ چلنے کی درخواست کی اور بادشاہ روانہ ہوگئے۔ اس سے محاصرے میں تقویت پیدا ہوگئی۔ اہل قلعہ پریشان ہوگئے۔ اور جب اس کی اطلاع ابراہیم عادل کو ہوی تو اس نے صلح کی درخواست کی۔ لڑائی کی ابتدا کرنے کے مقصد میں کامیابی ہوی اور خانہ جنگی ختم ہوگئی۔ دکن میں پھر توازن قائم ہوگیا۔ گولکنڈے کو اپنے پاکیزہ نصب العین میں پوری پوری کامیابی ہوی۔ فضا میں سکون پیدا ہوگیا۔ امن وامان کا دور دورہ رہا۔ اگرچہ بیجاپور اور احمدنگر میں کچھ جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن انکی حیثیت بالکل مقامی تھی۔ گولکنڈے کے اتحاد کے بندھنوں کو اور مضبوط کرنے کے لئے ابراہیم عادل نے محمد قلی

کی بہن چاند سلطانہ سے شادی کی۔ یہ رسم ۱۵۸۶ء میں ادا ہوی۔ ابراہیم عادل کی بہن خدیجہ سلطان کی شادی مرتضیٰ نظام کے بیٹے میران حسین سے ہوی۔ ان بندھنوں نے دکن کی سیاسی فضاء کو بالکل پُر سکون رکھا۔ اس دور میں دکن اپنے تمدنی ارتقاء کے منازل طے کر رہا تھا۔

ہند میں مغلوں کا پیر اسوقت جما جبکہ اگوسٹ ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی لڑائی میں کامیابی ہوی۔ اسکے بعد مغلوں مقابلے میں کوئی طاقت صف آرا ہونے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ جنگ پانی پت کے بعد مالوہ، بنگالہ، گجرات کشمیر، راجپوتانہ، قندہار اور کابل پر تسلط حاصل ہوگیا۔ اور جب دکن کی فضاء وجیانگر کے خاتمہ کے بعد اطمینان کی سانسیں لے رہی تھی۔ اکبر دکن کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کیونکہ مغلوں کا نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کی سیاسی تفریق اور طوایف الملوکی کو ختم کرکے ایک ہی وحدت قائم کیجائے۔

اس منشاء کی تعمیل کا آغاز ۱۵۹۵ء میں احمد نگر سے شروع ہوا۔ احمد نگر پر فوج کشی کرنے میں شہنشاہیت کے اعتبار سے اکبر حق بجانب تھا۔ کیونکہ ۱۵۸۹ء سے قبل برہان نظام شاہ اکبر کا درباری تھا۔ ۱۵۸۸ء میں مرتضیٰ نظام شاہ کا خاتمہ کردیا گیا۔ اور اُس کی جگہ پر اس کے بھائی حسین نظام شاہ ثانی کو تخت نشین کیا گیا۔ صرف دس مہینوں کے بعد جب یہ گھریلو کشمکش کا شکار ہوگیا تو چونکہ اسکی کوئی اولاد نہ تھی اور برہان اکبر کے دربار میں تھا اسلئے برہان کے بیٹے کو ۱۵۸۸ء میں تخت نشین کیا گیا۔ لیکن اکبر کی یہ خواہش تھی کہ خود برہان تخت نشین ہو اور جب اس نے فوجی امداد کیساتھ برہان کو احمد نگر بھیجنا چاہا تو برہان اکبر کی اس سیاسی چال کو سمجھکر احمد نگر کی رعایا کی ناراضی کا خوف دلاکر امداد حاصل کرنے سے انکار کردیا اور خود احمد نگر جاکر بآسانی تخت نشین ہوگیا۔ اکبر کو توقع تھی کہ وہ مغل سیادت اور شہنشاہیت کو تسلیم کرے گا۔ لیکن برہان نظام شاہ نے مغل سلطنت سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا۔ اکبر نے اسکو بغاوت تصور کیا۔ کیونکہ جب ایک درباری شہنشاہ کے ایماء سے بادشاہت کو پہنچے تو یہ توقع کیجاتی ہے کہ وہ شہنشاہیت کے زیر سایہ بادشاہت کے فرائض انجام دیگا۔

اسی زمانہ میں گولکنڈے کے پاس شہر حیدرآباد کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ تو دوسری طرف دکن کی سلطنتوں کے خاتمہ کا پروگرام تیار ہو رہا تھا۔ اکبر نے ۱۵۹۱ء میں چاروں والیانِ ریاست ہائے دکن کے نام سفراء کے ذریعہ اطاعت کی دعوت دی۔ والئی خاندیس راجے علیخاں نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن باقی تینوں سلطنتیں، احمد نگر، بیجاپور، اور گولکنڈے نے اس کو ٹھکرا دیا۔ لیکن حسب معمول سفراء کی با عزت آؤ بھگت ہوی۔ سفراء نے ۱۵۹۳ء میں والیان ریاست کے جواب سے شہنشاہ کو مطلع کردیا۔ اکبر کا جواب اعلان جنگ تھا۔ ۱۵۹۵ء میں احمد نگر پر مغلوں کا پہلا حملہ ہوا۔

اس حملہ کے وقت احمد نگر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اگر اسوقت سلطانہ چاند بی بی مغلوں کی روک تھام اور سلطنت کی حفاظت کا ذمہ نہ لیتی تو تاریخ میں ۱۵۹۵ء کے بعد احمد نگر کی وحدت کا کہیں پتہ نہ چلتا۔ سلطانہ

اپنی بہادری، ذکاوت، اور سیاست سے کام لیکر تمام خانہ جنگیوں پر قابو حاصل کرکے مغلوں کے مقابلہ میں صف آراء ہوی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور اسوقت تک مغلوں کی یورش سے محفوظ رہ سکتے تھے جبتک کہ احمدنگر باقی تھا۔ اس لئے ان والیوں نے بھی دور اندیشی سے کام لیکر اور احمدنگر کی فتح کے بعد کے نتائج پر غور کرکے احمدنگر کی ہر طرح مدد کی۔ فوجیں روانہ کی گئیں۔ گولکنڈے کی فوج مہدی قلی کی کمان میں تھی۔ یہ فوج میسرہ پر متعین تھی۔ اس جنگ میں دکنی فوج شہنشاہی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکی۔ لیکن شہنشاہی فوج نے بھی کافی نقصان اٹھایا۔

دو سال بعد خود شہنشاہ نے دکن کی تسخیر کے لئے اپنے پایۂ تخت سے کوچ کیا۔ پہلے شہنشاہ نے والئ خاندیس پر حملہ کیا کیونکہ راجہ علی خاں کا جانشین بغاوت پر آمادہ تھا۔ سنہ ۱۶۰۱ء میں احمدنگر کا دوسرا محاصرہ ہوا۔ دکن میں ملک عنبر کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کردیا گیا ہے کہ احمدنگر کے خاتمہ کیساتھ ہی گولکنڈے اور بیجاپور کو مغلوں کی یورش کا خطرہ تھا۔ اس لئے ان دونوں سلطنتوں نے سیاسی دور اندیشی کو کام میں لاکر برابر ملک عنبر کی امداد کی۔ محمد قطب شاہ اپنے پیشرو کی طرح سیاست دکن میں برابر حصہ لیتا رہا۔

اگرچہ یہ لڑائیاں ریاست احمدنگر سے تھیں اور بظاہر انکا تعلق بیجاپور یا گولکنڈے سے نہیں تھا لیکن ان لڑائیوں کا اثر برابر ان سلطنتوں پر پڑتا رہا۔ سنہ ۱۶۱۶ء اور سنہ ۱۶۲۱ء کے درمیان جب ملک عنبر شہنشاہی طاقت کا جس کا سپہ سالار شہزادہ خرم تھا مقابلہ نہ کرسکا اور مجبوراً صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا تو نتیجۃً گولکنڈے اور بیجاپور پر بھی خراج عائد کیا گیا۔ گولکنڈے کا خراج سب سے زیادہ تھا۔ گولکنڈے پر بیس لاکھ روپیہ خراج عاید کیا گیا۔ حالانکہ بیجاپور کا (۱۸) لاکھ، اور احمدنگر کے لئے (۱۲) لاکھ لگایا گیا تھا۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدنامہ کی تکمیل کبھی نہیں ہوی۔ شہزادۂ خرم کی بغاوت سے خود مغل سلطنت پریشان تھی۔ اور دکن کا فاتح خود دکن کے والیوں سے امداد کی درخواست کر رہا تھا لیکن سیاسی خطرات کے مدنظر شہزادہ کی ظاہرا کوئی مدد نہیں کی گئی۔ لیکن خفیہ طور پر کافی امداد پہنچائی گئی۔ کیونکہ انہیں دشمن خانہ جنگی میں مبتلا رہتا اور اوسکو دوسروں پر حملہ کا خیال تک کرنے کی فرصت نہ ہوئی۔ سلطان محمد قطب شاہ کی وفات تک تو دکن کی آزادی برقرار رہی لیکن جونہی کہ اس کا انتقال سنہ ۱۶۲۶ء میں ہوا اسی وقت سے دکن کی آزادی بھی آہستہ آہستہ سلب ہونی شروع ہوگئی۔ دکن کی آزادی کے محافظ تاریخ کی شہادت کی بناء پر محمد قطب شاہ ملک عنبر اور ابراہیم عادل ثانی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تینوں کے تینوں ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر فوت ہوگئے۔ ملک عنبر کی وفات کے بعد احمدنگر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ یہ سلطنت گولکنڈہ اور بیجاپور کے لئے اب تک فصیل کا کام دے رہی تھی۔ اب گولکنڈے کا دشمن کو دوبدو مقابلہ کرنا تھا۔ اب جب کبھی مغل حملہ آور ہوتے تو یہ سیدھے گولکنڈے اور بیجاپور تک آجاتے۔

سلطان محمد قطب شاہ کا جانشین ایک کم سن بچہ تھا جو حکومت کا بار گراں کسی طرح سنبھال نہ سکتا تھا مصیبت

تنہا نہیں آتی۔ نہ صرف احمد نگر کے لئے یہ وقت بُرا تھا بلکہ گولکنڈے کی بھی یہی حالت تھی۔ اور دکن کی دوسری سلطنتوں کے ساتھ گولکنڈہ بھی تیزی سے رُو بہ زوال تھا۔ قریبی زمانہ میں شمال میں بھی انقلابات ہوئے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کا انتقال ہو چکا تھا اور ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں تخت نشین ہوا۔

احمد نگر میں ملک عنبر کے بعد اس کا بیٹا فتح خاں پیشوا بنایا گیا جو نا اہل ثابت ہوا اور ہمیشہ مرتضیٰ سے اَن بَن رہنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن بعد ہی فتح خاں کو گرفتار کر کے دولت آباد روانہ کر دیا گیا مرتضیٰ کی بیوی فتح خاں کی بہن تھی۔

اسوقت پھر دکن کی خوش قسمتی سے مغل گورنر خانِ جہاں نے مرتضیٰ سے سازش کر لی۔ اور مرتضیٰ بالا گھاٹ کے مغل علاقوں پر قابض ہو گیا۔ شاہجہاں اس سے ناواقف تھا کہ خانِ جہاں بیوفائی کر رہا ہے۔ اسلئے اسکو تخت نشینی کے بعد کے انتظامات میں وہیں برقرار رکھا گیا۔ لیکن جب شاہی احکام کی تعمیل نہ ہوئی تو شہنشاہ نے خانِ جہاں کو معزول کر کے مہابت خاں کے بیٹے زماں خاں کو دکن بھیجا۔ خانِ جہاں مستقرِ حکومت کو واپس ہو گیا لیکن بہت جلد علمِ بغاوت بلند کر کے مرتضیٰ کی پناہ میں آگیا۔ یہ پناہ دینا احمد نگر کی تباہی کا باعث ہوا۔ اس سے شہنشاہی اقتدار اور وقار کو صدمہ پہنچا تھا کیونکہ شاہجہاں کے متعلق دکن میں پہلے ہی سے مخالفانہ خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان وجوہات کی بنا پر اپنا رعب قائم کرنے کے لئے خود شہنشاہ نے برہان پور میں قیام کیا اور یہیں سے فوجیں روانہ کی گئیں جو احمد نگر میں کامیاب ہوئیں۔ اسی زمانہ میں مرتضیٰ نے اپنی بیوی کے اصرار سے تنگ آکر فتح خاں کو رہا کر دیا تھا۔ اور پیشوائی کے فرائض دوبارہ اس کے سپرد کر دئے گئے تھے۔ اس نے انتقام کی خاطر مرتضیٰ کو قتل کر کے عوام کو دشمن بنا لیا اور ایک کمسن بچہ کو تخت نشین کر دیا۔ اس حادثہ سے قبل ہی فتح خاں کی رہائی نے احمد نگر کے ایک قومی سردار مقرب خاں کو بد دل کر دیا جو مغلوں سے مل گیا اور بہت سرفراز ہوا۔ ان تمام پریشانیوں نے انکو شہنشاہ کی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ اور شاہجہاں کے نام کا خطبہ و سکہ جاری ہو گیا۔

موجودہ حالت مغلوں کے لئے قابلِ اطمینان تھی لیکن فوراً ہی شہنشاہ کو معلوم ہو گیا کہ فتح خاں بیجاپور سے مل گیا ہے اور ساتھ ہی شاہ جی بھی اس اتحاد میں شریک ہے۔ حالانکہ شاہ جی مغلوں کی ملازمت میں تھا۔ اب مہابت خاں نے شہنشاہی احکام کی بنا پر فوج کی سپہ سالاری پر فائز ہو کر دکن کا رُخ کیا۔ قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ شاہ جی اور بیجاپوری فوجیں مغل افواج کو پریشان کرنے کی کوشش میں ناکام رہیں۔ جب قلعہ کی فصیل اُڑا دی گئی تو فتح خاں مطیع ہو گیا۔ اور اپنے بیٹے کو مہابت خاں کے پاس بطور یرغمال روانہ کیا۔ اسکے باوجود مہابت خاں نے فتح خاں اور حسین نظام شاہ سوم کو [illegible] ستمبر [illegible] شہنشاہ کی خدمت میں آگرہ روانہ کر دیا۔

اس فتح کے بعد احمدنگر کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے تھا لیکن شاہ جی نے نظام شاہی علاقہ پر بغیر کسی انتظام کے اسی خاندان کے ایک بچہ کو تخت نشین کر دیا اور موجودہ تعلقہ پر بنڈہ کو مستقر کی حیثیت دی۔ اس طرح پر شاہ جی کے قدم کچھ جمے۔ شہنشاہ شمال میں تھے، جہابت کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن مغلوں کو تو اپنی برتری اور سیاسی وحدت کی فکر تھی۔ شہنشاہ بحر ۱۶۳۵ء میں دکن آگئے۔ اور برہان پور میں قیام کرتے ہوئے دولت آباد پہنچے۔ یہاں سے گولکنڈے اور بیجاپور کو تنبیہ دی گئی کہ وہ درپردہ نظام شاہی فوجوں کو مدد کرنے سے باز آجائیں۔ اسی اثنا میں والئی بیجاپور محمد عادل شاہ نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ قندہار اور ناندیڑ پر گولکنڈے اور بیجاپور کی پیشقدمی روکنے کے لئے فوجیں متعین کر دی گئی تھیں۔ ایک فوج احمدنگر فتح کرنے کے لئے روانہ کر دی گئی تھی۔ تیسرا حصہ جنیر اور ناسک روانہ کیا گیا۔ باوجود مغلوں کی کثیر تعداد کے کئی مہینوں کی لڑائی کے بعد شاہ جی نے ہتھیار ڈالے۔ اور اسکو بیجاپور میں ملازمت کی اجازت دی گئی۔ اس طرح سے ۱۶۳۶ء میں مغلوں کی چالیس سالہ جنگ و جدال کا نتیجہ نظام شاہی سلطنت کے خاتمہ کے طور پر ظاہر ہوا۔

اب گولکنڈہ اور بیجاپور ریاست متاثر ہونے شروع ہوئے۔ عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کی مبارکباد شہنشاہ کی جانب سے آئی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ جہاں کو شہزادگی کے عہد میں خصوصاً بغاوت کے زمانہ میں سلطان قطب شاہ نے مدد دی تھی اور تخت و تاج کے حصول میں گولکنڈہ کی امداد کو دخل تھا۔ لیکن ۱۶۲۸ء میں شہنشاہ ہونے کے بعد وہ اس رشتہ کو توڑنا چاہتا تھا۔

قطب شاہی سلطنت کی حالت سیاسی طور پر بہت کمزور تھی۔ مغلوں کے سفیر کی بہت زیادہ آؤبھگت ہوتی تھی۔ جب شیخ محی الدین سفیر نے شہنشاہی رعب ڈالتے ہوئے بیجا مطالبات کی تکمیل چاہی تو عبداللہ قطب شاہ نے غیر معمولی طور پر ہمت سے کام لیکر اپنے پیشوا کو بدل دیا۔ شیخ محمد کو پیشوائی دی گئی۔ شیخ نے پوری قوت سے اس کی مدافعت کی اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور جب اس نے اس طرح بھی نہ مانا تو مغل فوجوں کے سپہ سالار آصف خاں کو اس سفیر کی شکایت لکھ بھیجی۔ اور ۱۶۳۶ء میں جبکہ شاہجہاں برہان پور میں تھے۔ شیخ محی الدین کو رسمی انعام و اکرام کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔ اور اپنے سفیر کے ذریعہ شہنشاہ کو تحائف بھیجے گئے۔ شہنشاہ خوش ہوئے اور اپنے سفیر کی گوشمالی کی۔

جب مغل فوجیں احمدنگر کے خلاف بالاگھاٹ پر برسرِ پیکار تھیں تو مغل فوج کا کچھ حصہ قندہار آگیا جو گولکنڈہ کا علاقہ تھا۔ اس اطلاع پر گولکنڈے سے تجربہ کار سپہ سالاروں کے تحت ایک فوج کولاس بھیجی گئی۔ تاکہ اگر مغل فوجیں آگے بڑھیں تو مزاحم ہوں۔

سلطنت کے شمال مشرقی حدود مغلوں کی یورش کے شکار بنے ہوئے تھے۔ اڑیسہ کے مغل گورنر نے قاسم کو

اور کالا پہاڑ میں لوٹ مار مچادی اور راج مندری کو تاک رہا تھا۔ قاسم کوٹہ سے یہ اطلاع ملنے پر دو سرداروں کے تحت فوج روانہ کی گئی جو سرحد پر ڈٹی رہی۔ لیکن ان میں سے ایک سردار کی وفات پر قطب شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ ایک اور سردار کے تحت امداد بھیجی گئی۔ لیکن اس امداد کے پہنچنے سے قبل ہی مغل سلطنت نے سدِّباب کر دیا۔ کیونکہ ابھی مغلوں کو قطب شاہوں کی دوستی درکار تھی۔ مغل فوجیں فوراً قطب شاہی سلطنت کے حدود سے ہٹا لی گئیں۔

سنہ ۱۶۳۳ء میں فتح خاں کی طرف سے مطمئن ہو کر شہنشاہ نے مغل سفیر کے ذریعہ قطب شاہی دربار سے کثیر رقم اور جواہر طلب کئے۔ قطب شاہی سلطنت اسکے لئے تیار نہ تھی کیونکہ بیجاپور کی سلطنت احمد نگر کی تائید میں مغلوں سے برسرِپیکار تھی اور دکن کے حالات مغلوں کے موافق نہ تھے۔ لیکن قدیم روایات اور مسلک کے خلاف گولکنڈے نے اس نازک موقع پر ان دونوں سلطنتوں کو کسی قسم کی امداد نہ دی۔ لیکن سلطنت گولکنڈہ موقع کی منتظر تھی تاکہ مغلوں کی سیادت کا جوا اتار پھینکے اسلئے مغل سفیر کو خوش تو کیا گیا لیکن شہنشاہی مطالبات کی تکمیل نہ کی گئی۔ شہنشاہ برہان پور سے شمال کو روانہ ہو چلے تھے اور مغلوں کو بیجاپور کے مقابلہ میں شکست ہو گئی تھی اس لئے قطب شاہی سلطنت کو اچھا موقع ملا۔

سنہ ۱۶۳۶ عیسوی میں دولت آباد کی فتح نے حالات کی کایا پلٹ دی تھی۔ شہنشاہ مزاحمت کی خاطر برہان پور آگئے تھے اس لئے اب گولکنڈہ اور بیجاپور کسی طرح سے مزاحم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس موقع پر ایک شہنشاہی فرمان دریائے نربدا کے کنارے سے گولکنڈہ روانہ کیا گیا جو بالکل حاکمانہ تھا۔ اسمیں تین مطالبات بدیں ہدایت کئے گئے کہ مغلوں کی کسی طرح سے مزاحمت نہ ہو، دکن کے امن کی خاطر مغلوں کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ ان میں ایک مطالبہ یہ تھا کہ خطبے میں شاہ ایران کے نام کی بجائے مغل شہنشاہ کا نام لیا جائے۔

. . . .

. . . .

. . . .

اس فرمان میں موجودہ حالت میں تسخیر نہ کرنے کا احسان یوں دھرا گیا کہ "مرحوم محمد قطب شاہ کی خدمات کے صلہ میں مرحوم کے بیٹے پر یہ سلطنت بحال رکھی جاتی ہے"

سفیر عبداللطیف کے گولکنڈہ پہنچنے سے قبل ہی پیشکش روانہ کر دئے گئے۔ شہنشاہی سفیر کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ بادشاہ سے ملاقات کے وقت انعام واکرام دئے گئے۔ شہنشاہ نے اب خان دوران کو گولکنڈے روانہ کیا۔ جب خان دوران ناندیڑ پہنچا (اس کے ساتھ فوج بھی تھی) تو رعایا پریشان ہو گئی۔ مدافعت کے لئے فوج

روانہ کی گئی۔ بادشاہ خود ضروری ساز و سامان کے ساتھ گولکنڈے میں محصور ہو گیا۔ لیکن یہ سب انتظامات بیکار ثابت ہوئے جبکہ پیشوا الشیخ محمد نے عبداللطیف سے معاہدہ کر لیا جسمیں شہنشاہی احکام کی پابندی کا وعدہ کیا گیا۔ یعنی خطبہ میں خلفائے راشدین کے بعد شاہجہاں کا نام، اور سکہ پر شاہجہاں کا نام ضرب کیا جائیگا۔ ساتھ ہی سالانہ دو لاکھ ہون یعنی آٹھ لاکھ روپیہ شہنشاہی جلوس کے نویں سال سے ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ نیز بقایا جو تیس لاکھ ہوتا تھا باقساط ادا کرنیکا وعدہ ہوا۔

اس کے بعد کئی دن تک عبداللطیف اس معاہدے کی تکمیل کے لئے حیدرآباد میں رہا۔ اور جب اطمینان ہو گیا تو جواہرات، کئی ہزار اشرفی، ایک سو ہاتھی اور پچاس گھوڑے (جنکی مالیت چھ لاکھ بتائی جاتی ہے) کے پیشکش کے ساتھ دولت آباد روانہ ہوا۔ شہنشاہ نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور سفیروں کو واپس کرتے ہوئے ایلچی ایک تصویر طلائی چوکھٹے میں لگوا کر ہاتھی اور قیمتی کپڑوں کے تھانوں کے ساتھ روانہ کی۔ اور اس تحریری معاہدے کے جواب میں ایک عہدنامہ طلائی تختی پر سنہ ۱۶۳۶ء میں کندہ کروا کر روانہ کیا جس کا خلاصہ یہ تھا" قطب الملک نے ہماری پیش کردہ شرائط کو قبول کر کے عمل شروع کر دیا ہے اور پیشکش بھی روانہ کر دیا ہے اس لئے تمام گزشتہ قصور معاف کر دئے جاتے ہیں۔ وہ اس کو اس سلطنت کا والی تسلیم کرتے ہیں۔ جب تک ان شرائط کی پابندی ہوگی ہم گولکنڈے کی امداد کرتے رہیں گے اور کسی طرح کا ضرر نہ پہنچنے دینگے۔"

ان شہنشاہی الطاف کے شکرانہ کے طور پر ایک مشہور ہاتھی اور ایک قیمتی الماس شہنشاہ کو نذر دیا گیا۔ اس معاملے کے بعد سے یعنی سنہ ۱۶۳۶ء سے قطب شاہوں کی آزادی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی اور اس سلطنت کی مثال ایک ریاست کی ہو گئی جو مغلوں کے زیر سایہ و حمایت زندہ رہ سکتی تھی۔ جب یہ معاملات صاف ہو گئے تو شہنشاہ اورنگ زیب کو صوبہ دار مقرر کر کے خود شمال چلے گئے یہ گورنری یا صوبہ داری سنہ ۱۶۳۶ء سے سنہ ۱۶۴۴ء تک جاری رہی۔ ریاست کی جانب سے معاہدے کی برابر تکمیل ہوتی رہی۔ لیکن جب شمالی حالات نے اورنگ زیب کو دعوت دی تو باوجود دوسرے انتظامات اور صوبہ داروں کی نگرانی کے دکن کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ . . . .

گورنروں کی نااہلی سے مغل سلطنت کے دکنی علاقہ کی حالت خراب ہو گئی۔ مالگزاری برابر وصول نہ ہونے لگی۔ اس کمزوری اور خانہ جنگی سے گولکنڈے اور بیجاپور نے بھی فائدہ اٹھایا اور سنہ ۱۶۳۶ء کے معاہدے سے گریز ہونے لگا۔ محاصرۂ قندھار کی ناکامی سے دکن میں مغلوں کے خلاف برا اثر پیدا ہوا۔ ان حالات میں پھر شہنشاہ نے سنہ ۱۶۵۲ء میں اورنگ زیب کو دکن روانہ کر دیا۔ لیکن اب اورنگ زیب کو مشکلات کا سامنا تھا مغل سلطنت کے مفتوحہ صوبوں میں نظم و نسق قائم کر کے گزشتہ عہد کے نقصان عظیم کی تلافی کرنی تھی اور بیجاپور اور گولکنڈے کی سیاسی، مذہبی اور معاشی حالت پر قابو حاصل کر کے سنہ ۱۶۳۶ء کے معاہدے کی تکمیل کرانی تھی۔

آب اورنگ زیب نے گولکنڈے کو خراج کے پیشکش کے لئے لکھا جو کئی سال سے سلطنت کے ذمہ تھا اور ہُون کی قیمت میں جو اضافہ ہوا تھا اُس شرح سے ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔

گولکنڈے کی دوسری عہد شکنی اور بدعہدی ایران سے سیاسی تعلقات تھے۔ اس شکایت کے علاوہ ایک تازہ شکایت راجہ کرناٹک کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے اسباب اس مضمون سے متعلق نہیں ہیں، راجہ نے شہنشاہ کی خدمت میں چالیس لاکھ ہُون، دوسو ہاتھی، اور جواہر وغیرہ بھیجکر سالانہ پیشکش کے وعدے کے ساتھ صرف مغلوں کی حمایت اور امداد کی درخواست کی۔ اسمیں یہ بھی لالچ دیا گیا کہ اگر شہنشاہ چاہیں تو مذہب اسلام قبول کرنے تیار ہے۔ اورنگ زیب نے بھی شہنشاہ کو پُر زور الفاظ میں امداد کی سفارش لکھ بھیجی۔

راجہ کرناٹک کی شکایت کے متعلق شہنشاہ کی خدمت میں دکن کے فرمانرواؤں کی طرف سے نذرانے گذرانے گئے اور درخواست کی گئی کہ وہ اس معاملہ میں دخل نہ دیں شہنشاہ راضی ہو گئے۔ بقیہ مغلوں کی شکایات رفع کر دی گئیں معاہدے کی تکمیل کی جانے لگی پیشکش کا بقایا ارسال کر دیا گیا۔

گولکنڈے کو اس نازک دور میں جس مشکل اور مصیبت نے حواس باختہ کر دیا وہ میرجملہ محمد سعید تھا۔ محمد سعید کی غداری، بے ایمانی اور نمک حرامی ضرب المثل ہو گئی ہے۔ محمد سعید ۱۶۳۰ء میں گولکنڈہ آیا۔ اسوقت اسکی حالت تباہ اور خستہ تھی۔ ماثر الامراء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ایک تاجر جواہر کا ملازم تھا۔ منوچی کا بیان ہے کہ وہ ایک گھوڑوں کے تاجر کا ملازم تھا اور اصطبل کی نگرانی پر مامور تھا۔ لیکن بہت جلد جواہر کی تجارت شروع کر دی دربار پولا کے توسط سے بادشاہ کے پاس رسوخ حاصل کر لیا۔ اور نذرانوں کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کر لی۔ اپنی اہلیت کو ظاہر کر کے درجہ بدرجہ ترقی کی اور ۱۶۴۹ء میں میرجملہ کا جلیل القدر عہدہ حاصل کیا۔ اس دور میں کرناٹک کی فتح کا منصوبہ تھا اور جنگ جاری تھی یہ کام میرجملہ محمد سعید کے سپرد کیا گیا۔ محمد سعید ۱۶۴۵ء میں کرناٹک کے بڑے حصہ پر قابض ہو گیا جس کا محاصل چالیس لاکھ بتلایا جاتا ہے۔ اس خطہ میں زر و جواہر کے معدن تھے یہاں میرجملہ نے جاگیریں حاصل کریں، جواہر کے نئے معدن دریافت کئے اور لاکھوں روپیہ کے جواہرات اپنے ہی قبضہ میں رکھے۔ جواہرات سے دلچسپی کی وجہ سے ماثر الامراء کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ سمندر میں اس کے تجارتی جہاز چلنے لگے قطب شاہی متعینہ فوج کے علاوہ میرجملہ کی اپنی ذاتی فوج بھی علحدہ تھی جسمیں فرانسیسی توپیں اور توپچی تھے۔ پانچ ہزار سوار، بیس ہزار پیادہ فوج کی تعداد بتلائی جاتی ہے۔ اس نرالی شان سے اطراف کے لوگ ڈرنے لگے اور فرانسیسی و پرتگالی تو نذریں دینے لگے۔

اس غیر معمولی قوت و اقتدار کو حاصل کر کے اب محمد سعید خود مختار حکومت کے منصوبے باندھنے لگا اور

خود کو قطب شاہی سلطنت سے بے نیاز تصور کرنے لگا تھا۔ خود بادشاہ کو بھی بدگمانی پیدا ہو گئی۔ کرناٹک کی فوج کشیوں سے جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا وہ مرکزی حکومت کو روانہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اور جب اس کے متعلق جواب طلب کیا گیا تو اُس نے کہا کہ کرناٹک کی فتوحات اُس کی ذاتی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہیں اس لئے مال غنیمت بھی اس کا اپنا ذاتی ہے۔ حکومت کو اس سے سروکار نہیں۔ اس طرز سے درباری چونک گئے۔ اور بادشاہ کو یقین دلانے لگے کہ یہ ایک روز باغی ہو جائیگا۔ اور جب یہ بغاوت کر بیٹھے تو کرناٹک کے دور دراز علاقوں میں قطب شاہی سلطنت کو اقتدار اور اثر حاصل نہ ہونے سے دشواری کا سامان تھا۔ اس کے برخلاف محمد سعید کرناٹک میں دولت اور قوت سے کافی مستحکم ہو گیا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے اُس کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی۔ مسلسل اصرار کے بعد وہ گولکنڈہ آیا۔ اور باریاب ہوا۔ لیکن جب اُس کو بادشاہ کے ارادہ سے آگاہی ہوی کہ اُس کو نمک حرامی کی سزا دیجانے والی ہے تو وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اب اُس کو اپنی فطرت کے خلاف قطب شاہوں کی وفاداری تو منظور نہ تھی لیکن ساتھ ہی وہ ان کا مقابلہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ کوشش کرنے لگا کہ ایران، بیجاپور یا سلطنت مغلیہ کی حمایت حاصل کرے۔ ایران اور بیجاپور نے اسکی درخواست کو نامنظور کیا لیکن گولکنڈے کے مغل سفیر کے کہنے اور اصرار کرنے پر اورنگ زیب نے شاہجہاں کے پاس اس کی سفارش کردی۔

جب مغل سلطنت کی اعانت کا علم بیجاپور کو ہوا تو وہ گھبرا گئی کہ کہیں وہ دشمن سے مل کر اُس کے راز فاش نہ کردے اس لئے اسکو منایا جانے لگا۔ میر جملہ مغلیہ سلطنت کی ملازمت کا خواہاں نہ تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ گولکنڈہ اور اُس کے ساتھ بیجاپور بھی اُس کی تباہی پر آمادہ ہیں تو اس نے مغلوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ تو صرف شہنشاہی سرپرستی میں آکر اس شہنشاہی اثر کو قطب شاہی سلطنت کے مقابلہ میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ شہنشاہ نے اُس کو پنج ہزاری منصب سے سرفراز کیا اُس کے بیٹے محمد امین کو دو ہزاری کا منصب دیا گیا۔ یہ اُس پیشکش کے جواب میں تھا جو میر جملہ نے شہنشاہ سے ان الفاظ میں کیا تھا " اگر گولکنڈے پر حملہ ہو تو میں اپنے چالیس ہزار سوار مغل شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں " ساتھ ہی پیراماونٹ قوت سے کام لیکر عبداللہ قطب شاہ کو دھمکی دی گئی جو شہنشاہ کی طرف سے تھی کہ میر جملہ اور اُس کے ساتھیوں پر کسی قسم کی دست درازی نہ کیجائے اتفاقاً ان احکامات کے پہنچنے سے قبل میر جملہ کا بیٹا محمد امین بحالت نشہ دربار میں حاضر ہوا اور مسند پر سو گیا ساتھ ہی قئے بھی کر دی۔ یہ سب مال و دولت اور مغلیہ حکومت کی سرپرستی کا غرور تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کو اپنے دربار کا وقار قائم رکھنا تھا اُسوقت چشم پوشی نہیں کیجا سکتی تھی اس لئے اُس نے محمد امین کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اس سے قبل شہنشاہی احکام کی اطلاع بادشاہ کو کردیگئی۔ لیکن اسنے شاہی وقار کی حفاظت کے لئے ان احکام کی پروانہ کی گرفتاری کے ساتھ مال و جائداد کی ضبطی کے احکام دیدئے۔ اسکو شہنشاہی حکام نے احکام کی خلاف ورزی

تقصور کیا جو سراسر سطح بینی اور خود غرضی کا نتیجہ ہے۔ اور مغل حکومت شہنشاہی وقار کے تحفظ پر تل گئی۔ اصل میں شہنشاہ کو اس قسم کے احکام ہی نہ دینے چاہیئے تھے کیونکہ اس میں سراسر خود غرضی تھی اور دوسرے کی عزت و ناموس عظمت و وقار کو عظیم صدمہ پہنچتا تھا۔ غرض محمد امین کو رہا کرنے کا حکم دیا گیا ساتھ ہی محمد سلطان کو جو اورنگ زیب کا بڑا بیٹا تھا ناندیڑ سے روانہ کر دیا گیا کہ وہ شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی کے آثار دیکھکر فوراً محمد امین کو فوج کی امداد سے رہا کرائے۔ اس کے علاوہ ایک مغل جنرل متعینہ دیوگڈھ کو حکم دیا گیا کہ وہ قندھار کی جانب پیشقدمی کرے محمد سلطان ۲۶ دسمبر ۱۶۵۵ء کو نکل کر ۷ جنوری ۱۶۵۶ء کو ناندیڑ پہنچ گیا۔

اسوقت تک عبداللہ قطب شاہ نے شاہی وقار کے تحفظ کے لئے شہنشاہی احکام سے جو بے پروائی برتی تھی وہ اس کے حوصلوں سے بہت زیادہ تھی۔ جب اس کو محمد سلطان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بہت گھبرایا اور مغل حملے سے بچنے کے لئے محمد امین اور اس کے دیگر تمام متعلقین کو رہا کر دیا۔ یہ رہا شدہ قیدی محمد سلطان کے حیدرآباد پہنچنے سے قبل ہی آملے اور اب بظاہر پیشقدمی کی کوئی وجہ باقی نہ تھی۔ لیکن جائداد وغیرہ ابھی ضبط تھی۔ نیز اورنگ زیب کا حکم ملا کہ وہ حیدرآباد جاکر ٹھہرے تاکہ محمد سعید میر جملہ کو اپنی حمایت میں لے۔ محمد سعید حسین ساگر پر دو دن قیام کرکے ۲۵ جنوری ۱۶۵۶ء کو حیدرآباد آگیا۔ عبداللہ قطب شاہ ۲۴ کو ہی شہر چھوڑ کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور یہاں محمد سلطان سے صلح کر لینی چاہی۔ لیکن یہ محمد سلطان کے اختیار سے باہر تھا۔ اب چونکہ شہر کی حفاظت کا سامان نہ تھا اسلئے لوٹ مار، تاخت وتاراج کا بازار گرم ہو گیا۔ حالانکہ بظاہر محمد سلطان کی جانب سے اس کی روک تھام کے احکام دئے گئے۔ اس کے بعد سے اگرچہ قطب شاہی افواج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی گئی تھی لیکن حقیقی معنوں میں محاصرہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ۷ فروری ۱۶۵۶ء میں شروع ہوا جو ۳۰ مارچ ۱۶۵۶ء تک جاری رہا۔ میر جملہ محمد سعید کو قطب شاہوں سے انتقام کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا اس لئے وہ بھی اس محاصرے میں اورنگ زیب کے ساتھ شریک رہا۔

قلعہ کے باہر شمال مشرقی سمت کی بلندی پر مغلوں کے مورچے تھے جس کی زد میں قلعہ تھا۔ اور جب کبھی قطب شاہی افواج حملہ کرتی تھیں تو قدم ڈگمگائے جاتے تھے اور شکست ہوتی تھی۔ قلعہ کی مدافعت بالکلیہ صرف موسیٰ برج سے کیگئی۔ اس لڑائی کی رفتار سے یہ اندازہ مشکل تھا کہ فتح کس کو ہوگی لیکن چونکہ عبداللہ قطب شاہ فطرتاً کمزور اور کم ہمت واقع ہوا تھا اس لئے اس نے کئی بار صلح کے پیشکش کئے اور سفیروں کے ذریعہ تحفہ تحائف بھی بھیجے۔ لیکن اورنگ زیب قطب شاہی سلطنت کی بیخ کنی پر تلا ہوا تھا اسلئے شرائط صلح سے بالکل ناراضی کا اظہار کرتا رہا۔ انہی دنوں میں شہنشاہی احکام آئے کہ عبداللہ کی پیشکردہ شرائط پر صلح کر لیجائے۔ ان احکام کے جاری ہونیکی وجہ پر مورخین کو اختلاف ہے۔ یُور بسنر کا بیان ہے کہ شاہجہاں اپنے گذشتہ دنوں کو یاد کر کے گولکنڈے سے فوج ہٹالینے کے

احکام دئے تھے۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ان دنوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی پہنچ گئی تھی۔ دارا پائے تخت میں شہنشاہ کی جانب سے حکومت کرنے لگا تھا۔ اور اورنگ زیب کا سخت مخالف تھا۔ اس مخالفت سے قطب شاہوں نے استفادہ کیا اور سمجھا بجھا کر محاصرے کے اٹھا لینے کے لئے احکام جاری کئے۔ لیکن اورنگ زیب نے ایک نہ سنی اور برابر محاصرہ کئے رہا۔ آخر میں عبداللہ قطب شاہ نے اپنے سفیر کے ساتھ اپنے داماد کو شہزادہ کے پاس بھیجا۔ پھر ملکۂ زمانی حیات بخشی بیگم بھی اورنگ زیب کی منظوری سے شرائط صلح طے کرنے کیلئے کیمپ آگئیں۔ بحیثیت قطب شاہی فرمانروا کی والدہ کے حیات بخشی بیگم کا استقبال کیا گیا اور صلح کر لی گئی۔ کچھ تو شہنشاہی احکام اور پھر ملکہ کی شخصی قابلیت و اہمیت نے صلح کے شرائط ماننے کے لئے اورنگ زیب کو مجبور کر دیا۔

شرائط صلح یہ طے پائے کہ عبداللہ کی بیٹی محمد سلطان کے عقد میں دیجائیگی۔ تاوان جنگ ستر لاکھ روپیہ ادا کیا جائے گا۔ نیز مغل سلطنت کی امداد کے لئے پانچ ہزار سوار دئے جائیں گے۔ ۴ر اپریل ۱۶۵۶ء کو شادی شاہانہ تکلفات کیساتھ ہو گئی۔ جہیز میں رام گیر کے علاقے دئے گئے۔ اور خفیہ طور پر عبداللہ سے یہ اقرار نامہ لکھوا لیا گیا کہ اس کا جانشین محمد سلطان ہو گا۔ اس کا علم شہنشاہ کو نہ کیا گیا کیونکہ یہ خطرہ سے خالی نہ تھا۔

قطب شاہوں نے اسوقت غیر معمولی طور پر دب کر صلح کی تھی اس لئے مغل صوبہ داروں کو جابرانہ مداخلت کا موقع مل گیا۔ سلطنت کو شہنشاہ اور صوبہ دار دکن کے علاوہ مغل حاجبوں کو بھی نذرانے پیش کرنے ہوتے تھے اور بہت بڑی دولت ان کی نذر ہو جاتی تھی۔ ان حاجبوں پر زر و جواہر کی بارش ہوتی تھی۔ برنیر کا بیان ہے کہ سلطنت میں احکام مغل سفیر جاری کرتا تھا اور یہی گولکنڈے کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ علانیہ بدسلوکی کیجاتی تھی۔ عوام کو مطالبات کی عدم تکمیل کی صورت میں خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیجاتی تھیں۔ اس لئے عوام اس آفت سے بیزار تھے۔ اور خیال کرنے لگے تھے کہ ہم مغلوں کی دشمن سلطنت کی رعایا ہونے سے ہم پر یہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اگر ہم مغلوں کی رعایا بنجائیں تو ممکن ہے کہ اس بدسلوکی اور ظلم میں کچھ کمی ہو گی۔ اس خیال کی پرورش یوں ہوئی کہ میر جملہ کی غیر معمولی اور بے جا مغل حمایت سے قطب شاہوں کے شاہی وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ امیر امراء اور اکابرین سلطنت بادشاہ کی وقعت نہ کرتے تھے اور راعی و رعایا کے بندھن بالکل ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ساتھ ہی امراء علانیہ طور پر اپنے نفع کی خاطر غریب رعایا پر ستم ڈھانے لگے۔ اس سے ایک طرف تو بادشاہ تنگ آکر گوشہ نشین ہو گئے اور شاہی نشست چھوڑ دی اور دربار بھی بند ہو گئے۔ اور دوسری طرف رعایا ان دوہرے مظالم سے تنگ آکر قطب شاہی سلطنت کا جوا اتار پھینکنے کی آرزومند ہو گئی۔

علی عادل شاہ ثانی اپنی وفات تک (۱۶۷۲ء) ایک طرف تو مغلوں کا راستہ روکے رہا۔ اور دوسری طرف مرہٹوں کی مدافعت کی۔ ۱۶۷۲ء میں مرحوم کا بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین کیا گیا۔ جبکی عمر صرف نو سال

تھی۔ طبقہ واری کشمکش کا بازار گرم ہوگیا۔ دکنی اور غیر دکنی طبقہ میں کشمکش شروع ہوگئی۔ مغل سپہ سالار کی تائید بیرونی پٹھانوں کے سردار کو حاصل تھی۔ اور اس نے بیجاپور میں لوٹ مار اور ذلت و خواری کا بازار لگا دیا۔ ۱۶۷۲ء میں شہنشاہ نے شہزادہ معظم کو واپس بلاکر بہادر خاں کو صوبہ داری عطا کی۔ اسمیں یہ راز تھا کہ بہادر خاں بیجاپور پر حملہ کرے۔ لیکن باوجود مسلسل احکام کے حملہ نہ ہوسکا کیونکہ سیوا جی نے ۱۶۷۶ء میں بیجاپور سے اتحاد کر لیا۔ اور عادل شاہیوں نے تین لاکھ ہون یک مشت اور ایک لاکھ سالانہ دینے کا معاہدہ کیا اسلئے بہادر خاں اور بیجاپور میں جنگ شروع ہوگئی، اور بہادر خاں کو شکست ہوگئی۔

لیکن اس موقع پر گولکنڈے کی خارجی پالیسی عبداللہ کی سی نہ تھی بلکہ وہی قدیم پیشروؤں کا مسلک اختیار کیا گیا تھا۔ بیجاپور کو اس کشمکش سے نجات دلانا گولکنڈے کی حیات کے لئے ضروری تھا۔ اور جب بیجاپور پر مغلوں کی یورش شروع ہوئی تو گولکنڈے سے مادنا نے بڑی فوج کے ساتھ مدد کی۔ لیکن جنگ کے اصول کے اختلافات سے بہادر خاں نے فائدہ اٹھایا۔ اور مادنا کو ترغیب دیکر امداد سے باز رکھا جسکی وجہ سے بیجاپور کو بے سہارا چھوڑا گیا اور وہ گولکنڈہ واپس آگیا۔ اس واپسی پر مورخین مادنا پر رشوت کا الزام لگاتے ہیں جو قرائن سے کچھ نامناسب نہیں دکھائی دیتا۔ بہرحال اس کی وجہ سے سلطنت عادل شاہی کو عظیم ترین صدمہ پہنچا۔ نلدرگ، اکل کوٹ اور گلبرگہ پر مغل قابض ہوگئے۔

بہادر خاں کی پچھلی شکستوں کو اس کے رقیب دلیر خاں نے نمک مرچ لگاکر شہنشاہ کو سنایا۔ اور اس کو معزول کرایا۔ بہادر خاں کی جگہ خود دلیر خاں کو دیگئی۔ یہ سب کچھ ۱۶۷۷ء میں ہوا۔ دلیر خاں نے اپنی فوجوں کو ملکھیڑ تک پھیلا دیا۔ ملکھیڑ قطب شاہی علاقہ پر تھا۔ اب شہنشاہ سے درخواست کی گئی کہ اگر امداد بہم پہونچائی جائے تو وہ گولکنڈے کو آسانی سے فتح کرلے گا۔ اور یہ درخواست منظور کرلیگئی۔ اب قطب شاہیوں کو مدافعت کرنی تھی۔ محمد ابراہیم کو ملکھیڑ روانہ کیا گیا۔ مغل فوج گلبرگہ میں محاصرے کئے ہوئے تھی۔ قطب شاہیوں کو پہلے شہنشاہی فرمان دیا گیا جسمیں سیوا کی مدد نہ کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر خود دلیر خاں نے گولکنڈے کو دھمکی دی کہ سیوا جی کی مدد کی گئی تھی اس لئے تاوان کے طور پر ایک کروڑ روپیہ اور دس ہزار گھوڑے ادا کرے۔ امدادی فوج بہلول خاں کے تحت آگئی۔ بہلول اور دلیر خاں نے متحدہ طور پر ملکھیڑ پر حملہ کر دیا۔ قطب شاہی فوج تو تیار تھی گھمسان کا رن پڑا۔ مغلوں کا جانی و مالی نقصان زیادہ ہوا۔ اس کے علاوہ گولکنڈے سے تازہ دم فوج آگئی۔ مغلوں کو دو مہینے کے طویل عرصہ تک نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اور یہ تمام وقت بیس میل کی مسافت بارہ دن میں طے کرکے مغل فوجیں گلبرگہ پہنچیں اور اس دوران میں مغلوں کو غلہ اور پانی تک بھی برابر میسر نہ ہوسکا۔

بیجاپور کے ایک قدیم خدمتگار کی استدعا پر ابوالحسن قطب شاہ نے سلطنت کے اندرونی معاملات میں دخل دینا

قبول کیا۔ فتنہ و فساد کی جڑ بہلول خاں کو جو بیجا پور میں عادل شاہیوں کی طرف سے حاکم بنایا گیا تھا، بیجا پور سے علیحدہ کر دیا اور وفادار ملازم مسعود خاں کو پیشوا بنا دیا۔ ساتھ ہی بہلول کو ابو الحسن نے اپنے پاس بلا کر نمک کا پاس دلانا چاہا۔ بہلول بیماری کے سبب حاضر نہ ہو سکتا تھا اسلئے جمشید خاں کو گولکنڈے سے روانہ کیا۔ جمشید کو بادشاہ نے سمجھایا اور وہ بہت متاثر ہوا۔ جب جمشید نے بہلول خاں سے مل کر نصیحت کی تو بہلول نے بخوشی پیشوائی سے دستبرداری کر لی اور مسعود خاں و بہلول خاں میں حسب ذیل شرائط پر صلح ہو گئی:-

(۱) افغانوں کی واجب الادا تنخواہ گولکنڈے سے قرض لیکر ادا کر دی جائے۔

(۲) افغان سپاہی فوج سے علیحدہ کر دیئے جائیں۔ اور تنخواہ صرف اسی شرط پر دی جائے کہ وہ حدود سلطنت سے باہر چلے جائیں۔

(۳) بہلول سلطنت کے کاروبار سے بے دخل ہو جائے اور جاگیر میں رہے۔

(۴) بیجا پور کی حکومت کو مشورہ دینے کے لئے گولکنڈہ کا ایک حاجب رہے۔

(۵) مغلوں سے کوئی معاہدہ اس عہد نامہ کے خلاف نہ کیا جائے۔

اس کے معاوضے میں گولکنڈے نے بیجا پور کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ گویا کہ سلطنت بیجا پور، گولکنڈے کی سیادت میں زندہ تھی اور گولکنڈہ بیجا پور سے فصیل کا کام لے رہا تھا۔

معاہدے کی تکمیل ہونی شروع ہو گئی۔ مسعود اور سکندر عادل نے اس معاہدہ کی توثیق کی اور مسعود پیشوا بنا دیا گیا۔ حاجب کے خدمات اکنا کے سپرد ہوئیں۔ لیکن اسی کے وقت مسعود نے دلیر خاں سے اس معاہدے کے منافی ایک معاہدہ کر لیا۔ یعنی یہ کہ مسعود سیواجی کے خلاف مغلوں کی مدد کرے۔ سکندر عادل کی بہن بادشاہ بی بی مغل شاہزادہ کو بیاہ دی جائے۔ اس عہد شکنی سے دکن کے معاملات پھر درہم برہم ہو گئے۔ ابو الحسن نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا اور افغانوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر مسعود خاں کا اقتدار بیجا پور میں قائم ہوا۔ اور نہ ہی مغلوں کے ہاں ۱۶۷۸ء میں اکنا واپس بلایا گیا۔ اس عہد شکنی سے ابو الحسن زیادہ متاثر نہ ہوا۔ بلکہ پھر بیجا پور کے آڑے وقت یعنی ۱۶۸۳ء میں مغلوں کے بیجا پور کے حملے کے وقت سکندر نے مدد مانگی اور شہنشاہ کی دھمکی کے خلاف ۱۶۸۵ء میں بیجا پور کو امدادی فوج روانہ کر دی گئی۔ ابراہیم کو کلتاکش اکل کوٹ پر متعین تھا کہ گولکنڈے اور بیجا پور کے تعلقات پر نگرانی رکھے۔ میرہ منو خاں گولکنڈے کی سرحد پر تھا۔ اور جب یہ فوجیں روانہ ہوئیں تو منزل پر پہنچنا دشوار ہو گیا۔ جب شہنشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ ابو الحسن قطب شاہ نے چالیس ہزار جرار فوج روانہ کر دی ہے تو شاہ عالم کے تحت "ملکھیڑ" پر حملہ کے لئے فوج روانہ کر دی گئی۔ جب بیجا پور سے مغل فوجوں کو فراغت ہوئی تو ان سب نے گولکنڈے کا رُخ کیا۔

مادنّا کی پالیسی ابتداءً ملک پرستی تھی۔ اجنبی لوگوں کو ملکی عہدوں سے علیحدہ کرکے ملکیوں کو ملازمت دی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ملک پرستی نے پاک جذبہ میں تعصب کا گھن لگ گیا۔ اور بہت جلد مرکزی حکومت میں تلنگے اور مادنّا کے عزیز و اقارب دکھائی دینے لگے۔ مسلمان جو ملازمت سے علیحدہ کئے گئے تھے انہوں نے مغلوں کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور گولکنڈے کے خلاف مغلوں کو مدد پہنچاتے رہے۔ خود گولکنڈ کی آزاد بنیتہ مسلم رعایا مادنّا کے خلاف ہوگئی اور موقع ملنے پر نہ صرف مادنّا کو بے رحمی سے قتل کیا بلکہ خاندان ہی کو مٹا دینے کی سعی کی۔ اس زمانہ میں گولکنڈے کے قول و قرار کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ مورخین مادنّا کیلئے تاریخ میں واقعات کی بناء پر سخت و سست الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے اُس کی غیر ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ اور تو اور محل کی خواتین سے معاہدے ہوے وہ سراسر گولکنڈے کے مسلک کے خلاف اور گولکنڈہ کے حق میں انتہائی مُضر تھے۔ اس کے علاوہ بیجاپور کی عین وقت پر مدد کرنے سے احتراز کو بھی کچھ اچھی نظروں سے نہ دیکھا گیا۔ کیونکہ اسی سبب سے بیجاپور کو بُرے دن دیکھنے پڑے جس کے بعد وہی دن گولکنڈے کے حصہ میں آئے۔ مادنّا پر بادشاہ کو غیر معمولی اعتماد تھا۔ اس اعتماد سے اس نے بے جا فائدہ اُٹھایا وقت بے وقت بلا امتیاز دوست و دشمن رشوت لیکر اس نے لوگوں کے کام بنائے اور سلطنت کو نقصان پہنچایا۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد بیس سال تک امن و امان رہا۔ مغلوں کا مقابلہ کرنے والی طاقتیں ابھی زندہ تھیں، مرہٹے تو اس زمانہ میں شاہراہ ترقی پر تھے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور اگرچہ ترقی پر نہ تھے لیکن اپنی حالت سنبھالے ہوے تھے۔ بیجاپور کے مقابلہ میں جے سنگھ، دلیر خاں اور بہادر خاں کو شکست جیسے سپہ سالاروں کو منھ کی کھانی پڑی تھی۔ لیکن ۱۶۸۰ء میں سیواجی کے بعد سنبھاجی کی گدی نشینی نے پھر دکن کے امن و امان میں رخنہ اندازی شروع کردی۔ سیواجی کی لوٹ مار میں عزت و ناموس کا پاس کیا جاتا تھا۔ لیکن سنبھاجی نے اس طریقہ کو متروک قرار دیا۔ دوسرے سال بھی یعنی ۱۶۸۱ء میں دکن کی تہذیب و تمدن کے مرکز برہان پور میں لوٹ مار اودھم مچادی۔ بہادر خاں اس کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اور جب اہل برہان پور نے احتجاجاً نماز جمعہ کی ادائی سے انکار کردیا کہ امن و امان کی صورت ہی نہیں ہے اور دکن 'دار الحرب' بنا ہوا ہے تو شہنشاہ نے خود دکن کا ارادہ کیا۔ اس ارادہ کے عملی جامہ پہننے کا بڑا سبب یہ ہوا کہ شہنشاہ کا چھوٹا بیٹا شہزادہ اکبر راجپوتوں سے سازش کرکے شہنشاہ سے منحرف ہوگیا۔ اور ایک شہزادہ کے راجپوتوں سے جا ملنے سے شہنشاہی تاج و تخت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اورنگ زیب نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جلد دکن کا رخ کیا۔

۱۶۸۱ء میں شہنشاہ ساری فوجی طاقت کے ساتھ دکن آگئے۔ اولین مقصد شہزادہ اکبر کی سرکوبی اور دکن کو مرہٹوں سے نجات دلانا تھا۔ اس کے علاوہ مغلوں کے مسلک یعنے "کل ہند کی شیرازہ بندی کی جائے

اور ہندوستان میں ایک سیاسی وحدت پیدا کیجائے۔ کی کامیابی کے لئے دکن کی سلطنتوں کا خاتمہ ضروری تھا۔ یہ منصوبہ اکبر کا تھا۔ لیکن حالات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اکبر کے جانشینوں نے اس منصوبہ پر کبھی غور نہ کیا اور صرف اس کی تکمیل کرتے رہے دکن کو جس بُرے طریقہ کے ساتھ سلطنت میں شامل کیا گیا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ سیاستِ دکن کی پیچیدگی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان اسلامی شیعہ سلطنتوں یعنی گولکنڈے اور بیجاپور کا تعلق ایران کے صفویوں سے تھا۔ ایران کے صفوی کبھی مغلوں کو طاقتور دیکھنا نہیں چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اکثر قندھار اور کابل میں معرکہ آرائی ہوتی رہی اور دکن کی سلطنتوں نے بھی اسی دشمن سلطنت (ایران) کا دامن تھاما تھا۔

شہنشاہ برہان پور میں تین چار ماہ قیام کرکے اورنگ آباد آگئے۔ ۱۶۸۳ء میں مغل فوج مرہٹوں کے مقابلہ میں ناکام رہی۔ اور ہر جگہ بڑے نقصان کے ساتھ شکست اُٹھانی پڑی، اسوقت تک شہنشاہ کو دکن کی اسلامی سلطنتوں کی بیخ کنی کا خیال پیدا نہ ہوا تھا لیکن جب اس نے مرہٹوں کی طاقت کا اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ جس طرح سے یہ سلطنتیں نظام شاہیوں کی امداد کیا کرتی تھیں اسی طرح سے اسوقت مرہٹوں کی مدد کیجا رہی ہے تاکہ ان کو آڑ بنا کر گولکنڈہ و بیجاپور کو محفوظ رکھ سکیں۔ اب شہنشاہ نے یک لخت مرہٹوں کا تعاقب ترک کردیا۔ اور ساری فوجی طاقت اسلامی سلطنتوں کی بیخ کنی پر استعمال کیجانے لگی۔ سب سے پہلے ۱۶۸۴ء میں شہزادہ اعظم کے تحت بیجاپور پر فوج کشی کی گئی۔

گولکنڈے کے متعلق بھی اب شکایات پیدا ہوگئے تھے۔ محمد سعید میر جملہ نے گولکنڈے کے تمام راز ہائے سربستہ کو شہنشاہ پر منکشف کردیا تھا۔ اور اب شہنشاہ وقت بے وقت بڑے بڑے مالی مطالبات کرتا تھا۔ جسکی مجبوراً سربراہی کیجاتی رہی۔ اور جبکہ سلطنت میں ہندوؤں کو اقتدار حاصل ہوگیا۔ یعنی اکنا و ماذنا برسر تھے۔ اور سنبھاجی کی مدد کیجانے لگی تو شہنشاہ نے بیجاپور کے محاصرے کے دوران میں ابو الحسن قطب شاہ کو ہدایت کی کہ وہ سکندر عادل شاہ والئی بیجاپور کی کسی قسم کی مدد نہ کرے۔

۱۶۸۵ء میں بیجاپور کے محاصرے کو مؤثر بنانے کے لئے شہنشاہ شولاپور آگئے۔ بہرہ مند خاں کو حیدر آباد کی نگرانی کے لئے متعین کیا گیا تاکہ گولکنڈے کی فوج بیجاپور کی فوج کو مدد نہ پہنچا سکے۔ لیکن قطب شاہی فرمانروا اپنے آبائی خارجی مسلک سے گریز نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ ایک سلطنت کے وجود کا دار ومدار دوسرے کی بقا پر تھا۔ اگر بیجاپور کا خاتمہ ہو جائے تو گولکنڈہ تنہا مغلوں کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ اس لئے ابو الحسن نے پہلے مراری راؤ کے تحت ایک فوج بھیجی۔ سرحد کی ناکہ بندی اس فوج کی مزاحم ہوی۔ آخری زمانہ میں جبکہ محاصرہ بہت سختی کے ساتھ جاری تھا۔ خلیل اللہ خاں پلنگ، کے تحت چالیس ہزار فوج دوبارہ بیجاپور کی امداد کے لئے

روانہ کی گئی۔ ابو الحسن نے اس فوج کی روانگی کی غرض و غایت کو اپنے ایک خط موسومہ محمد معصوم و محمد جعفر (جو گولکنڈے کے حاجب تھے اور اب شہنشاہ کے ہاں نظر بند تھے) میں اس طرح ظاہر کیا:-

"شہنشاہ کو ایک بزرگ ہستی تسلیم کیا گیا لیکن اب جبکہ شہنشاہ معصوم اور یتیم سکندر پر حملہ آور ہوئے ہیں سکوت روا نہیں۔ خلیل اللہ خاں کے تحت فوج روانہ کی جا رہی ہے۔ دوسری طرف سے سنبھاجی حملہ آور ہوگا۔ پھر دیکھا جائیگا کہ مغل ان طاقتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ خط شہنشاہ کو پہونچا ہوگا۔ کیونکہ یہ تو نظر بند تھے اور ان کے حرکات و سکنات پر بہت سخت نگرانی تھی اور اس کا علم غالباً ابو الحسن کو نہ تھا۔ اس خط کو دیکھکر شہنشاہ ضبط نہ کر سکے۔ باوجودیکہ بیجاپور کا محاصرہ بہت سخت کر دیا گیا تھا اور فوج کو گولکنڈے بھیجنا محاصرے میں کمزوری کا باعث ہوتا تھا۔ لیکن شہنشاہ نے ایک بڑی فوج شہزادہ معظم کے تحت حیدرآباد روانہ کر دی۔ کیونکہ اس موقع پر گولکنڈے کو آزاد رہنے دینا خلاف مصلحت سمجھا گیا ساتھ ہی بہادر خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی مستقر سے نکل کر شہزادہ سے جا ملے۔ مغل فوجوں کا پڑاؤ گولکنڈے کی سرحد ملکھیڑ پر ہوا

خان جہاں کو کلتاش ملکھیڑ پہنچا۔ اور شاہزادہ معظم دو تین منزل پیچھے تھا۔ مغلوں کے اس ہراول کو قطب شاہی فوجوں نے روکا اور یہ فوج ایک قلعہ میں محصور ہوگئی لیکن بہت جلد معظم آ پہنچا۔ اور جنگ سے گریز کرتے ہوئے صلح کی تجاویز پیش کیں۔ کہ اکنّا و مادنّا حکومت سے خارج کر دئیے جائیں اور سیرم و رام گیر کے علاقے مغلوں کے حوالے کر دئیے جائیں ساتھ ہی بقایا پیشکش ادا کر دیا جائے۔ قطب شاہی فوج نے اس صلح کے پیشکش کو ٹھکرا دیا اور مدافعت برابر جاری رہی۔ مدافعت کے دوران میں مغل محصور کر لئے گئے۔ لیکن ایک مغل ہاتھی نے ایسی اودھم مچائی کہ قطب شاہی فوج تاب نہ لا سکی اور ساکت ہوگئی لیکن تازہ کمک آنے پر پھر جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ دنوں بعد ایک سخت معرکہ ہوا جسمیں مغل سردار تمام کے تمام زخمی ہوئے، لیکن بدقسمتی سے پھر بھی شکست قطب شاہیوں کے حصہ میں آئی اور فوج فرار ہونے لگی۔ ایک مغل سپہ سالار نے تعاقب کا مشورہ دیا۔ لیکن معظم نے ٹال دیا اور خیمہ لگا کر ٹھیر گیا تاکہ بارش کا موسم ختم ہو جائے۔ اس طرح سے چار پانچ ماہ تک مکمل سکوت طاری رہا۔ لیکن جب شہنشاہ نے احکام دئے تو شہزادہ بادل ناخواستہ حملے کیلئے تیار ہوا۔ پہلے گولکنڈے کے پاس صلح کی تجویز روانہ کی کہ سیڑم، کوہیر، ملکھیڑ، وغیرہ کے علاقے دئے جائیں تو وہ شہنشاہ سے صلح اور عفو کے لئے سفارش کریگا۔ لیکن یہ پیشکش بھی رد کر دیا گیا۔ سیڑم کے قریب پھر مقابلہ ہوا اور قطب شاہی شکست خوردہ فوج نے سیڑم کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ جب شکست کا یقین ہوگیا تو قطب شاہی فوج نے مغلوں سے قدیم طریقہ جنگ کے اختیار کرنے کی درخواست کی تاکہ گھمسان کی لڑائی میں اکثر جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں اور صرف دو سپاہی، فتح و شکست کا فیصلہ کر لیں لیکن قطب شاہی سپاہیوں کی مہارت دیکھتے شہزادہ کو اس چیالنج کے قبول کرنے

باز رکھا۔ ایک رات قطب شاہی فوج کے دو بڑے عناصر دکنی اور غیر دکنی فریقوں میں اختلاف ہوگیا۔ اور ساری کی ساری فوج نے حیدر آباد کا رخ کیا۔ اب مغل شادیانے بجانے لگے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل سر لشکر مغلوں سے سازش کر کے جا ملا تھا اور جب اس غداری سے بادشاہ کو آگاہ کیا گیا تو وہ احتیاطی تدابیر کے طور پر تمام لوگوں سے بدظن ہو گئے سر لشکر کی غداری اور پھر فوج کی مسلسل شکست سے ابو الحسن کا حوصلہ جاتا رہا۔ اور وہ راتوں رات شہر سے قلعہ میں محصور ہوگیا۔ بادشاہ کا اس طرح سے قلعہ میں چلا جانا شہریوں کیلئے فال بد تھا۔ ان کے جاتے ہی تمام شہر کے انتظامات درہم برہم ہوگئے لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا مغل سپاہیوں نے بلا امتیاز شرافت و نجابت لوٹ مار شروع کر دی۔ شرفاء کے مکانات آگ کی نذر ہوگئے۔ خود شاہی محلات کو آتشزدگی کے کئی صدمے پہنچے۔ بادشاہ ایسے یکایک شہر چھوڑ گئے کہ تمام شرفاء و معززین اپنی حفاظت کا بندوبست نہ کر سکے اور جب لوٹ مار شروع ہوگئی تو انکو سوائے قلعہ کے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ سامان کی نقل و حرکت بہر زمانہ کی منتقلی انتظام طلب تھی لیکن جب شرافت خطرہ میں آگئی تو ان بیچاروں نے اپنی بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کر قلعہ کی جانب فرار ہونا چاہا۔ حتیٰ کہ بعض وقت برقعہ وغیرہ سے بھی بے نیازی برتی گئی۔ اسی حالت میں کئی ایک قید کر لیے گئے۔ شہزادہ معظم نے اس لوٹ کھسوٹ کو روکنے کے لئے فوج متعین کی لیکن یہ فوج خود لوٹ مار میں شریک ہوگئی۔

جب یہ ہمت شکن ماحول ابو الحسن کے روبرو تھا تو اس کو سوائے عاجزانہ صلح کی درخواست کے اور کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اور جب عاجزانہ صلح کا پیشکش ہوا اور شہزادہ معظم کے پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے کا وعدہ کیا گیا تو شہزادہ نے شہنشاہ سے صلح کی سفارش کا وعدہ کیا۔ تجاویز صلح یہ تھے:۔

(۱) قطب شاہی سلطنت ہر سال دو لاکھ ہون اور بقایا ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ ادا کریگی۔
(۲) اکنا و مادنا علیحدہ کر دئے جائیں گے۔
(۳) متنازع علاقے مغلوں کے سپرد کر دئے جائیں گے۔

جب ان تجاویز صلح کو شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے بظاہر خوشنودی کا اظہار کیا اور سپہ سالار اور شہزادہ کے مناصب میں ہمت افزا اضافہ کیا۔

رقم وغیرہ کی فراہمی کی دشواری کو بادشاہ نے اس طرح طے کیا کہ شہزادہ سے شہر سے باہر چلے جانے کی درخواست کی اور جب شہزادہ باہر چلا گیا تو رقم فراہم ہوگئی۔ لیکن ہندو وزراء کے معزول کرنے کا سوال ابو الحسن کے پاس بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اور وہ کسی طرح عمل کرنے کے لئے راضی نہ تھا لیکن مغل تو مغل خود گولکنڈے کے مسلمان اور محل کی بیگمات ان وزراء سے بیزار تھیں۔ اور جب ابو الحسن سے اس میں تامل و تاخیر ہوئی تو ان لوگوں نے سازش کر کے ان دونوں وزراء کو جبکہ وہ بادشاہ کے پاس سے واپس ہو رہے تھے قتل کرا دیا۔ اس سازش سے

بادشاہ بے خبر تھے۔ ان کے محافظ دستہ فوج کو پہلے سے ہی فراہم کر لیا گیا تھا۔ اور وہ اُسوقت مزاحم نہ ہوا۔ ان وزراء کے سر قلم کر کے شہزادہ معظم کے پاس روانہ کر دئے گئے جو شہنشاہ کے پاس ارسال کر دئے گئے۔ گھر لوٹ لئے گئے، ان کے ساتھی و ہمسایہ لوگوں کے گھر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے، اور اگر بادشاہ بروقت روک تھام نہ کرتے تو اُس وقت ان کو بہت کافی جانی و مالی قربانیاں دینی پڑتیں۔

اس فتح سے شہنشاہ کو دلی خوشی نہ ہوی لیکن یہ اطمینان ضرور ہو گیا کہ اب مغلوں کے مفاد کی مخالفت کرنے والا گولکنڈے میں کوئی نہ رہا۔ اسی وجہ سے شاہ عالم شہزادہ معظم واپس بلا لیا گیا۔ مغل فوجیں قطب شاہی علاقوں سے ہٹالی گئیں۔ شہزادہ ۷ رجون ۱۶۸۶ء کو واپس شولا پور پہنچا اور ۱۲ رجون ۱۶۸۶ء کو قطب شاہی حاجب نے شہنشاہ کے پاس باریاب ہو کر تسو ناتھی نذر کئے۔

اس صلحنامہ سے قطب شاہی سلطنت کو انتہائی دھوکہ دینا مقصود تھا۔ کیونکہ شہنشاہ گولکنڈے کے خاتمہ کیلئے یہاں آئے تھے اور اب اس صلحنامے سے ناراض تھے۔ لیکن رسماً اور مصلحتاً ان شرائط کو قبول کر لیا گیا۔ اور ان شرائط کی وسعت سے بیجا فائدہ حاصل کیا گیا۔ مغل مفادات کی مخالفت کرنے کیلئے تو کوئی موجود نہ تھا اور دوسرا اطمینان شہنشاہ کو اس لئے ہوا کہ وہ گولکنڈے سے برسرپیکار رہکر بیجاپور کو کسی طرح مسخر نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے گولکنڈے سے صلح بیجاپور کے خاتمہ کیلئے ضروری تھی۔ اس لئے اب تمام فوجی طاقت بیجاپور پر صرف کی گئی۔ اور جب یہ فتح ہونیکے قریب تھا تو مغل حاجب متعینہ گولکنڈہ کو راز میں فرامین وصول ہوتے رہے کہ وہ پیشکش وغیرہ کے سلسلہ میں بادشاہ یعنی ابوالحسن قطب شاہ سے سختی سے پیش آئے۔ اور جب اس سختی کا جواب ابوالحسن بھی سختی سے دیگا تو شہنشاہی وقار کی آڑ لیکر استیصال کیا جاسکیگا۔ لیکن اس جال میں مغلوں کو سراسر ناکامی ہوی۔ ۱۲ ستمبر ۱۶۸۶ء کو بیجاپور فتح ہو گیا اور اب شہنشاہ گولکنڈے کی طرف متوجہ ہونا چاہتے تھے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۶۸۶ء کو حیدرآباد کے عزم سے شہنشاہ روانہ ہو گئے۔ گلبرگہ میں حضرت بندہ نوازؒ کی زیارت سے فارغ ہو کر بیدر چلے آئے۔ یہاں پہنچکر گولکنڈے کے حاجب کو حکم دیا گیا کہ وہ پیشکش کا بقایا وصول کرے۔ زرنقد کی عدم موجودگی کے باعث بادشاہ نے تو خوانچے زروجواہر سے بھرے ہوئے حاجب کے ہاں روانہ کر دئیے۔ بظاہر اب شہنشاہ کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ تھی لیکن یہ طریقہ عمل تو محض قطب شاہوں کو دھوکہ دینے کے لئے تھا کہ مغل تسخیر کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ اپنے مطالبات کی تکمیل کے خواہاں ہیں۔ ابوالحسن بھی اسی دھوکہ میں تھا۔ اور اسکو توقع تھی کہ جب شہنشاہ کو زروجواہر کے ارسال کی اطلاع ہو جائیگی تو وہ رُک جائیگا۔ زروجواہر کا تخمینہ وصول طلب رقم سے کہیں زیادہ تھا۔ اس پیشکش کے ارسال کرنے کے بعد ابوالحسن مطمئن تھا۔ اور وہ مدافعت کی کوئی تیاری نہ کرسکا۔ ارسال پیشکش کے بعد بھی شہنشاہ کی نقل وحرکت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ اور جب بادشاہ نے ان خوانچوں کو واپس طلب کیا تو جواب ملا کہ وہ شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دئے

۸ار دسمبر سنہ ۱۶۸۶ء کو شہنشاہ گولکنڈے سے کچھ فاصلہ پر تھے اور یہیں سے محاصرہ شروع کر دیا گیا۔ جب بادشاہ نے شہنشاہ کی خدمت میں عاجزانہ صلح کی درخواست کی تو ابوالحسن پر متعدد الزامات لگائے گئے اور قرآن پاک کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کا حوالہ دیکر بتلایا گیا کہ اُس کا طرزِ عمل دین و دنیا ہر دو جگہ قابلِ ملامت ہے۔ مغلوں کی تیاری تو بہت وسیع تھی۔ لیکن قطب شاہیوں کو اب تک دھوکہ میں رکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ اچانک طور پر مدافعت کا کافی بندوبست نہ کرسکے۔ سپہ سالار فوجوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اور دستوری طور پر انھیں ہدایت دی گئی جس میں تاکید کی گئی کہ مغلوں کی شکست اور شہنشاہ کی گرفتاری کی صورت میں شہنشاہ کا کافی احترام کیا جائے۔ یہ ہدایت خواب کی بات ثابت ہوی۔ کیونکہ اگر اس وقت تمام سردار اور سپہ سالار عبدالرزاق لاری کے سے جاں نثار اور وفادار ہوتے تو مغلوں کو یہاں ایسی شکست ہوتی کہ انکی ساری کامیابی و کامرانی پر پانی پھر جاتا۔

۲۷ دسمبر سنہ ۱۶۸۶ء کو سخت خونریز جنگ ہوی۔ کئی بہادر اور راجپوت سردار کام آگئے۔ قلعہ سے قندو مد کے ساتھ آتشباری کی گئی۔ شاہ عالم یعنی شہزادۂ معظم اسوقت بھی صلح کر لینا چاہتا تھا اور کچھ مراسلت اس سلسلہ میں ابوالحسن سے ہوی تھی۔ لیکن جب اس کا علم شہنشاہ کو ہوا تو شاہ عالم اور اُس کی بیوی نظربند کر دئے گئے۔ اور سپہ سالاری کے جملہ فرائض فیروز جنگ پر ڈالدئے گئے۔ محاصرے کے وقت ایک کثیر تعداد فوج مغلوں کی مزاحمت اور رکاوٹ کے لئے قلعہ کے باہر متعین تھی۔ اور یہ ایسے حملے کرتی تھی کہ مغل پریشان ہو جاتے تھے۔ کئی مغل فوجیں ان حملوں کی نذر ہو گئیں۔

اس دوران میں فیروز جنگ نے شبخون کی تیاری کی اور قلعہ کی فصیل پر سیڑھیوں اور رسّیوں سے چڑھنے لگے۔ دن بھر کی سخت محنت و جانفشانی کے بعد سپاہی اور چوکیدار غافل سو رہے تھے۔ لیکن ایک کُتا چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس شبخون کی تیاری کی سرسراہٹ سے کُتا بھونکنے لگا۔ اور اس شدت سے بھونکا کہ سارا قلعہ بیدار ہو گیا۔ مغلوں کو سخت نقصان پہنچا۔ سیڑھیاں اور رسّیاں کاٹ کر گرا دی گئیں۔ اس طرح جانی نقصان بھی بہت ہوا۔ ابوالحسن اس کُتے سے بہت خوش ہوے۔ "سہ طبقہ" خطاب (یعنی خان، بہادر، جنگ) دیا گیا اور گلے میں سونے کا پٹا باندھا گیا۔ مغلوں کو اس شبخون میں یکسر ناکامی ہوی اور سخت جانی و مالی نقصان ہوا قلعہ کے سپاہیوں نے دشمن کی اس پریشانی سے فائدہ اُٹھاکر توپخانے پر حملہ کر دیا اور کئی توپچی ختم کر دئے گئے۔

جون کے وسط میں محاصرے کو چار مہینہ ہو چکے تھے۔ لیکن مغلوں کی مشکلات کہیں زیادہ تھیں۔ مسلسل دو سال بارش نہ ہونے سے مغلونکی حالت خراب تھی اسکے علاوہ سنبھاجی مغلوں کے خلاف گولکنڈے کی امداد کرتے ہوے ہر جگہ کی فصلیں برباد کر دیتا تھا تاکہ مغلوں کو غلہ میسر نہ آئے۔ مئی کے مہینہ میں یکایک زور و شور سے بارش شروع ہو گئی۔ اس سے آمد و رفت اور فراہمی غلہ میں اور دقت ہوی۔ نیز مورچے اور دمدمے تمام ستیاناس ہو گئے۔

اس نقصان سے قلعہ والوں نے فائدہ اُٹھایا۔ ۱۵ رجون کو قطب شاہی سپاہیوں نے اس شدومد سے حملہ کر دیا کہ تمام مغل افسر فرار ہو گئے اور بہت سے بھاگتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے۔ تمام توپیں بیکار کر دی گئیں۔ بارود چرالی گئی۔ گرفتار شدہ عہدہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ لیکن پھر بھی شہنشاہ کو اسوقت شہنشاہی وقار کا خیال آڑے آیا۔ اور وہ ان مسلسل غلطیوں نقصانات کے باوجود گولکنڈے کے خلاف جنگ پر تیار ہو گئے اکثر لوگ اور مفتی وغیرہ سب کے سب اس داروگیر کے مخالف تھے۔ جب قاضی شیخ الاسلام سے اس بارے میں مشورہ لیا گیا تو اُس نے اسکو بالکل ناجائز قرار دیا کیونکہ گولکنڈے اور بیجاپور کے فرمانروا مسلمان تھے۔ اس فتوے سے شہنشاہ ناراض ہو گئے۔ اس صداقت پسند نے مستعفی ہو کر حجاز کا رستہ لیا۔ اسکی جگہ قاضی عبداللہ مامور ہوا اور اس نے بھی حق کو باطل پر قربان نہیں کیا۔ اس پر بھی شاہی عتاب ہوا۔

چار مہینے محاصرے کے گذرنے پر ابوالحسن نے پھر ایک مرتبہ صلح کی عاجزی کے ساتھ درخواست کی اور کہا کہ۔ "آپ اس قلعہ کا انتظام میرے سپرد کیجئے، کیونکہ مجھکو ہمدردی ہے۔ اور میں محنت و جانفشانی سے کام کرونگا۔ اس کا کثیر معاوضہ ادا کرونگا۔ جب آپ اس طرف آئیں تو ہر منزل پر ایک کروڑ روپیہ نذر دونگا۔ یہ شرائط میں اسلئے قبول کرنا چاہتا ہوں کہ اس جنگ اور محاصرے میں مسلمانوں کا ناحق و ناروا خون ہو رہا ہے۔" اس میں ابوالحسن نے مغلوں کے ایک عہدہ کو قبول کیا تھا کہ وہ مغلوں کی جانب سے حکومت کریگا۔ اور اُس کا معاوضہ اس قدر عظیم تھا۔ لیکن شہنشاہ نے بہت حقارت سے انتہائی درشت الفاظ میں اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔

اس کے بعد محاصرہ کو بہت سخت کر دیا گیا۔ ابتدا میں مغلوں کو ہر طرح ناکامی ہوئی جو تدبیر کیجاتی تھی وہ اُلٹی ان ہی پر پڑتی تھی۔ فصیل میں کئی مرتبہ نقب لگا کر بارود سے اُڑانے کی کوشش کی گئی۔ جسمیں بہت مایوسی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ ۲۰ رجون کو سُرنگیں اُڑانے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ فصیلوں میں نقب لگا کر بارود بھر دی گئی۔ قلعہ والوں نے اس بارود کا بہت بڑا حصہ نکال لیا اور باقی بارود کا رُخ مغلوں کی طرف پھیر دیا۔ اور جب مغل فوج نے یہ سُرنگ اُڑائی تو قلعہ کی فصیل تو بالکل محفوظ رہی لیکن اُن کی ہی فوج کے سینکڑوں آدمی مر گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اس موقع پر قطب شاہی فوج نے یورش کی اور کشت و خون کے دریا بہا دیئے۔ دوسری مرتبہ بھی اسی طرح سے مغلوں کو نقصان پہنچا۔ ان مسلسل ناکامیوں نے مغل فوج کے دل اُچاٹ کر دیئے۔ مآثر عالمگیری و خافی خاں کے بموجب تو بہت سے مغل سپاہی اور معمولی سردار قطب شاہیوں سے مل گئے تھے۔ جب بالکل مایوسی ہونے لگی تو شہنشاہ خود فصیل کے قریب آ گئے تاکہ سپاہیوں کو ہمت ہو۔ اور وہ خود اس کام میں حصہ لینے لگے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کئی سردار اور خود محاصرے کی روح رواں غازی الدین خاں فیروز جنگ سخت زخمی ہوئے۔ مغلوں پر یورش کے دوران میں قطب شاہی سپاہی ایسی پھرتی دکھاتے کہ مغل حیران رہجاتے۔ دشمن کے سامنے سے توپیں

بارود، وغیرہ ایسے لیجاتے کہ مغل مزاحم نہ ہو سکتے تھے۔ اور پھر ان ہی توپوں سے مغلوں پر آتشباری کیجاتی۔ اسی محاصرے کے دوران میں بادل اسقدر چھا گئے کہ دن میں اچھا خاصہ اندھیرا ہو گیا اور موسلا دھار بارش نے جل تھل ایک کر دیا۔ اب تو مغلوں پر خدائی قہر نازل ہوا۔ توپ خانے بہ گئے بارود بیکار ہو گئی۔ اسکے علاوہ وبا پھوٹ پڑی ان دونوں مصائب نے ملک حشر برپا کر دیا۔ ہر طرف لاشوں کے پشتے لگے رہتے۔ اور اس کو سوائے ندی نالوں میں بہانے کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ عبور و مرور کا سوال بھی نہ تھا۔ زمین دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ان سے قطب شاہی فوج کافی استفادہ حاصل کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ تو موقع و محل سے کافی واقف تھی اسلئے کافی حملے کئے گئے اور ہر وقت مغلوں کو پسپائی ہوتی قطب شاہوں کو کافی مال غنیمت ہاتھ آتا تھا۔ شہزادہ کام بخش اور وزیر اعظم اسد خاں کی مشترکہ کوشش کے باوجود ۱۱ ر جون کو سرنگ اڑانے کی کوشش میں ناکامی ہوئی۔ جب سرنگ اڑائی گئی تو کچھ بھی نہ ہوا۔ کیونکہ قطب شاہی فوج تمام بارود نکال کر اپنے استعمال میں لے چکی تھی۔

۱۰ رجون کو شہزادہ اعظم اور روح اللہ خاں تازہ کمک کے ساتھ آ گئے۔ اس کے علاوہ قطب شاہی سردار شیخ منہاج مغلوں سے جا ملا تھا۔ شہزادہ اعظم فیروز جنگ کی علالت کی وجہ سے سپہ سالار مقرر ہوئے تھے۔ قلعہ کے اطراف لکڑی اور مٹی کی دیوار بنا کر نئے مورچے کھڑے کئے گئے۔ لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلا۔ ابوالحسن قلعہ کے اندر ہی رہے۔ تمام سلطنت میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اور حیدرآباد کا نام " دار الجہاد " رکھا گیا۔ اسوقت تک کے محاصرے کی حالت اور رفتار سے صاف ظاہر تھا کہ مغلوں کو اس میں سراسر ناکامی ہوگی اور مغلوں کو بھی اس کا یقین تھا۔ موجودہ صورت حال ظاہر کر رہی تھی کہ قلعہ کی تسخیر ناممکن ہے۔ صرف ایک صورت باقی تھی سو وہ اسلئے ناممکن تھی کہ رسد کی فراہمی دشوار تھی۔ اس لئے وہ اُسوقت کا انتظار نہ کر سکتے تھے۔ جبکہ قلعہ والے رسد سے مایوس ہو کر ہتھیار نہ ڈالیں۔ اہل قلعہ بھی اسوقت دشمن کو بیزار کرنے اور تھکانے کے لیے سب کچھ کر رہے تھے۔ ان حالات کے مدنظر مغلوں کو بالآخر محاصرے سے ہاتھ اُٹھا لینا پڑتا تھا لیکن عین اِن اُٹھانے کے بعد قدرت خود مغلوں کا ساتھ دینے والی تھی۔ قطب شاہی فوج کے سردار نمک حرامی کر گئے تھے۔ اسوقت صرف دو شخص یعنی۔ عبدالرزاق لاری جس کا خطاب مصطفےٰ خاں تھا اور عبداللہ خاں پنّی طرفدار رہ گئے تھے۔ باقی تمام سردار و سپہ سالار مغلوں سے مل گئے اور اسکی ملازمت و مناصب اور عنایات سے مشرف تھے۔ اواخر اگست تک یہ لوگ اپنے فرائض برابر ادا کرتے رہے۔ لیکن شہنشاہ نے جب دیکھا کہ قلعہ والے طاقت سے مرعوب نہیں ہو رہے ہیں تو اُس نے ایک اخلاق سوز حرکت کے ذریعہ سے تمام قطب شاہی سرداروں کو اپنے سے ملا لیا۔ لیکن اسوقت تک یہ دونوں شہنشاہی لالچ میں گرفتار نہ ہو سکے۔ لیکن عین اُسوقت جبکہ مغل ان دو وفاداروں کی متحدہ طاقت کے مقابلے سے عاجز آ گئے۔ شہنشاہی لالچ کا حربہ عبداللہ خاں پنّی پر کارگر ہوا۔ اب تک جتنے بھی سردار اور سپہ سالار

دغا کر گئے یا دشمنوں کے ساتھ ہو گئے وہ بالکل علانیہ طور پر ہوے تھے لیکن عبداللہ خاں دوست نما دشمن اور مار آستین بنکر رہا۔ قلعہ ہی میں رہکر مغلوں کی طرفداری کی۔ وہ بظاہر مدافعت کے لئے تیار تھا لیکن درحقیقت مغلوں کی امداد پر کمر باندھا ہوا تھا۔ آخر کار ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو اس خوفناک دغا اور سازش کا حال کھلا۔ پچھلی شب ہی میں مغل فوج قلعہ کے اندر اسی دروازہ سے داخل ہو گئی جو سازش کے نتیجہ کے طور پر کھلا رکھا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے مشہور سپہ سالار روح اللہ خاں، مختار خاں، رحمت خاں، صف شکن خاں اور جاں نثار خاں نے اندر داخل ہو کر محل کا رخ کیا۔ شہزادہ اعظم ہاتھی پر سوار ہو کر باہر کھڑا رہا۔ جب یہ لوگ اندر داخل ہوئے تو فتح کے شادیانے بجائے گئے اور فتح کا شور ہونے لگا۔

جب یہ اطلاع عبدالرزاق لاری کو ہوئی تو وہ بدحواسی میں صرف تلوار اور سپر سے مسلح ہو کر گھوڑے پر سوار بارہ ساتھیوں کے ہمراہ موقع پر پہنچ گیا۔ بارہ ساتھی اور ایک سردار ملکر اس عظیم مغلوں کے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے۔ گویا کہ آفتاب کی شعاع کو ایک ذرہ روکنے کی سعی کرنے چلا تھا۔

اس سیلاب میں اس کے ساتھی ایسے منتشر ہو گئے کہ ان کا پتہ نہ چلا لیکن لاری تن تنہا مدافعت کرتا رہا اور آخر تک یہی کہتا رہا۔ "جاں دادم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود" اس مدافعت میں اس کو اس قدر زخم لگے کہ ان کی گنتی نہ ہو سکی۔ چہرہ پر ہی بارہ زخم تھے۔ زخموں سے چور ہو جانے سے ہوش و حواس قائم نہ رہ سکے۔ اور غشی کی حالت طاری ہو گئی۔ اور گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گھوڑے پر خود تو سنبھلا رہا لیکن گھوڑا قابو میں نہ تھا۔ گھوڑا ابھی اپنے مالک کے ساتھ وفادارانہ خدمات انجام دیتا رہا۔ اور جب طاقت باقی نہ رہی تو آہستہ آہستہ نگینہ باغ آیا۔ لاری، ناریل کے درخت کا ٹیکہ لیکر زمین پر گرا۔ دوسرے دن چند سپاہی اتفاق سے ادھر سے گذرے اور بعض علامتوں اور نشانیوں سے لاری کو پہچان کر اسکے مکان پہنچا دیا۔

مغلوں کے اس طرح سے اچانک قلعہ میں داخل ہونے سے ایک اضطراب عام ہو گیا۔ لیکن خود بادشاہ بہت مطمئن تھے۔ اور ان سے کوئی حرکت خلاف معمول سرزد نہ ہوئی۔ بادشاہ تین بجے شب کے وقت آرام کر رہے تھے جب اطلاع ملی تو وہ پہلے خاص محل میں آئے اور سب کو دلاسا دیا۔ پھر شاہی لباس زیب تن فرما کر دیوان خاص میں شاہی مسند پر متمکن ہوئے۔ گویا کہ وہ آخر وقت تک بادشاہ رہکر اپنا جائزہ اپنے جانشین کو دے رہے تھے۔ ملازمین کو حکم دیا گیا کہ برابر وقت پر دسترخوان تیار کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد ناخواندہ مہمان یعنی مغل ابوالحسن کو لینے کے لئے آگئے۔ بادشاہ نے خود سلام علیک کہا اور بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کا استقبال کیا۔ اور جب یہ مغل سپہ سالار بھی بیٹھ گئے اور ملازمین شاہی نے دسترخوان لے چنے جانے کی اطلاع دی تو بادشاہ نے ان کو بھی کھانے پر مدعو کیا۔ اس ضبط و استقلال کو دیکھ کر سب متحیر تھے۔ آخر روح اللہ خاں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ ناشتے کا کیا

وقت تھا؟ جواب ملا کہ میں اسی وقت ناشتہ کرتا ہوں، پھر روح اللہ خاں نے پوچھا اس پریشانی میں آپ کی طبیعت کھانے کی طرف کس طرح مائل ہوی۔ تو ابوالحسن نے جواب دیا کہ میں راضی برضا ہوں۔ فیصلۂ قدرت مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ بادشاہی سے قبل میرے پندرہ بیس سال فقیری میں گذرے اور اب پھر فقیری کیلئے تیار ہوں اسکے بعد گھوڑا منگوا کر بادشاہ شاہی لباس ہی میں گھوڑے پر سوار ہو کر ساتھ ہو گئے۔ مؤلف ماہ نامہ کا بیان ہے کہ بادشاہ مہابت خاں کے ساتھ اُسی ہاتھی پر سوار کرائے گئے ایشوروداس کہتا ہے کہ ابوالحسن کو فیروز جنگ نے تخت سے اُٹھا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ منوچی کہتا ہے کہ ابوالحسن کو قید کر کے شہزادۂ اعظم کے خیمہ پر لے گئے۔ اور اُن کے بیدار ہونے تک بادشاہ کو دھوپ میں کھڑا رکھا گیا۔ لیکن ان سب میں بادشاہ کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوے پہلی بیان کردہ روایت ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

جب بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے قلعہ میں مرد اور عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں جب مغل افسروں کے ساتھ بادشاہ اعظم کے سامنے آئے تو ابوالحسن نے اپنے گلے کا موتیوں کا ہار اعظم کے گلے میں ڈالدیا۔ اعظم اسکو خاص عزت و وقار کے ساتھ شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔ شہنشاہ نے خود عزت و تعظیم کی اور اسکی ضروریات کا انتظام کر کے اپنے خیمہ میں ٹھہرانے کا حکم دیا۔

روح اللہ اور دیگر سپہ سالار مال غنیمت کی طرف متوجہ تھے۔ اور جب انھوں نے فہرست تیار کی تو جواہر، آلات مرصع، ظروف طلا وغیرہ کے علاوہ چھ کروڑ اسّی لاکھ دس ہزار روپیہ ہوے۔ جو خزانہ میں داخل کر لئے گئے سپاہیوں کا اپنا حصہ علحدہ تھا۔ جو اَن گنت تھا۔ اس لوٹ مار میں مغلوں نے گولکنڈے کے تہذیب و تمدن کو سخت نقصان پہنچایا۔ فن تعمیر کی لطیف و نازک یادگاروں کو ڈھایا گیا۔ آرائش کا سامان برباد ہو گیا۔ دربار اور محل کے قالین اسقدر بڑے اور وزنی تھے کہ فوج کے دستہ بھی اُسکو گھڑی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ کاٹ کر ٹکڑے کر دئے گئے۔ اور اُن ٹکڑوں کو سپاہیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ سلطنت کے بے شمار لوگ مغل ملازمت میں داخل کر لئے گئے۔ اور خطابات و مناصب سے سرفراز ہوے۔ عبدالرزاق لاری کی وفاداری سے شہنشاہ بہت متاثر ہوے۔ طبیبوں اور ڈاکٹروں کو علاج کا حکم ہوا۔ اور انھوں نے رپورٹ کی کہ سر کے زخم کی گنتی مشکل ہے، بظاہر ستّر نظر آتے ہیں، ایک آنکھ محفوظ ہے، لیکن بعد میں دونوں آنکھیں بیکار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ شہنشاہ متعجب ہوے اور اس سخت تکلیف کے باوجود اُس کی وفادارانہ خدمات بہت متاثر کر رہے تھے۔ شہنشاہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ "اگر لاری جیسے ایک دو سردار اور ہوتے تو قلعہ کی تسخیر ناممکن تھی"۔ تیرہ روز کے بعد لاری نے آنکھ کھولی۔ اور کچھ گفتگو کی۔ جب شہنشاہ کو اطلاع ہوی تو انھوں نے پیغام بھیجا کہ "تمام قصور معاف کئے جاتے ہیں، تمکو اور تمھارے بیٹوں کو خطابات، مناصب اور عہدوں سے سرفراز کیا جائیگا"۔ لیکن لاری نے

اس کو سنکر کہا، وہ جسکے گوشت و پوست میں ابوالحسن کا نمک ہو، عالمگیر بادشاہ کی ملازمت نہیں کرسکتا۔ شہنشاہ اس سے خفا ہو گئے۔ لیکن جب پوری صحت ہوئی تو پھر یہی پیشکش کیا گیا۔ لیکن وہ اس دفعہ بھی ٹھکرا دیا گیا۔ شہنشاہ بہت برہم ہوئے۔ فیروز جنگ نے بیچ بچاؤ کر کے کسی طرح لاری کو راضی کرلیا اور شہنشاہ کے ہاں سفارش کردی۔ ایک سال بعد کہیں لاری رضامند ہوا۔ چار ہزاری منصب، تین ہزار سوار، خاں کا خطاب، گھوڑا اور ہاتھی عنایت ہوئے لاری نے دل سے نوکری قبول نہ کی اور چند سال بعد ہی اصرار کر کے حج بیت اللہ کی اجازت لی اور چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

تمام تسخیر مکمل ہونے تک محرم کا مہینہ شروع ہو گیا۔ اس لئے گولکنڈے کا خاتمہ ۱۰۹۸ھ یا ۱۶۸۷ء کا واقعہ ہے۔ میر عبدالکریم المخاطب بہ ملتفت خاں نے تاریخ فتح " فتح گولکنڈہ مبارک باد " سے نکالی ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر شہنشاہ حیدرآباد آئے۔ تمام شاہی محلات اور عمارتوں کا معائنہ کیا۔ اور اواخر دسمبر ۱۶۸۷ء میں حیدرآباد سے بیجاپور روانہ ہو گئے۔

جانے سے قبل تمام انتظامات کئے گئے۔ حیدرآباد کا نام دارالجہاد تجویز کیا گیا تھا۔ روح اللہ خاں عارضی طور پر گورنر مقرر ہوا۔ اس سفر میں ابوالحسن بھی ساتھ تھے۔ لیکن جب بیدر پہونچے تو ابوالحسن نے تقاضۂ خودداری کے تحت شہنشاہ سے درخواست کی کہ کہیں گوشہ نشینی کی اجازت دیجائے۔ دولت آباد کا قلعہ گوشہ نشینی کے لئے تجویز کیا گیا اور جاں سپار خاں جس کا نام سید بہادر دل خاں تھا پہنچانے کے لئے روانہ کیا گیا اور واپسی کے بعد دکن کی گورنری کا جائزہ حاصل کیا۔ ایک محافظ دستے کے ساتھ ابوالحسن قلعہ میں نظربند کر دئے گئے۔ تمام ضروریات کا خاطرخواہ بندوبست کیا گیا۔

قطب شاہوں کی دوسو سالہ سلطنت ختم ہو گئی۔ اور سوائے تباہ حال آثارِ قدیمہ کے اور کوئی شئے باقی نہ رہی فقط

انوار احمد صدیقی

متعلم سال اول

دُہری خدمتیں

تجکو اے دل! خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے
بُرق بننا ہی نہیں ہے، بُرق دوڑانا بھی ہے

آسماں نے کی ہیں دُہری خدمتیں تیرے سپرد
چونکنا بھی ہے تجھے، اوروں کو چونکانا بھی ہے

تجھکو راہِ زندگی پر صرف آنا ہی نہیں
ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لانا بھی ہے

تا کُجا دیکھے گا خود ہی جوہرِ تیغِ اصیل
اُٹھ، کہ اب اس تیغ کے لوہے کو منوانا بھی ہے

ہو چکا بس دُور سے نظارۂ پست و بلند
اب تجھے اِن گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھانا بھی ہے

مُنہ سے کہنا ہی نہیں ہے موت کو "عمرِ خضر"
بلکہ مرکب تجکو اس وادی میں دوڑانا بھی ہے

موت سے بڑھکر نہیں کوئی نگہباں زیست کا
تجکو یہ نکتہ سمجھنا بھی ہے سمجھانا بھی ہے

منتِ ساقی کا خود پہنے ہے تو گردن میں طوق
ورنہ تیرے دل میں صہبا بھی ہے پیمانہ بھی ہے

جوشؔ

سلطان قلی قطب الملک

قلعہ گولکنڈہ کے ابتدائی حالات اور اسکی قدامت

"گولکنڈہ" تاریخ کی روشنی میں ہمیشہ جدال وقتال کا مرکز رہا ہے۔ یہہ ہندوستان کے اُن متعدد پہاڑی قلعوں میں سے ہے جس نے ذی اقتدار بادشاہوں، اَن گنت خزانوں اور زر اندوختہ دولت کی حفاظت کی۔ نہ صرف یہی بلکہ تباہیوں کے اعتبار سے بھی دنیا کا لاجواب قلعہ ہے۔ تاریخ کے اوراق اُن عالی ہمت، ذی اقتدار، رعایا پرور شاہوں کی عظیم الشان کوششوں اور بے شمار کارناموں سے بھرے پڑے ہیں جنھوں نے بازیگاہ عالم پر اپنی بے مثل اداکاریوں کے گہرے اور تشفی بخش نمونے چھوڑے ہے۔ گولکنڈہ بھی انہی یادگاروں میں سے ایک ہے جسکی تاریخ رومان سے لبریز ہے۔

گولکنڈہ کا ذکر کرتے ہوے مشہور سیاح سندباد اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے "یہاں کے سردار "الف لیلیٰ" کی داستانوں کے سردار معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہاں کے بادشاہ ہارون رشید سے کہیں زیادہ دولتمند اور آرام وآسایش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

مشہور عالم سیاح مارکوپولو ۱۲۹۲ء میں رانی رودرما دیوی کے عہد میں ورنگل آیا تھا۔ سندباد کے بیان کردہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوے گولکنڈہ کے متعلق لکھتا ہے "اہل گولکنڈہ بیشمار ہیرے اور قیمتی جواہرات اور بڑے بڑے موتی رکھتے ہیں جنکو اُس دور کے اور دیگر ممالک کے بادشاہوں نے حاصل کرلیا۔ درحقیقت اہل گولکنڈہ دنیا کی تمام دولت اور خزانے اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔"

اطالوی سیاح نکولو کانٹی جو ۱۴۲۰ء یا ۱۴۲۱ء میں وجیانگر میں مقیم تھا۔ گولکنڈہ کے ہیرے کی کانوں کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہیرے ایک پہاڑ سے برآمد ہوتے ہیں اس کا نام الھینی گارا ہے" جن کا ذکر سندباد کے قصوں میں مذکور ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کانوں کی طرف اطالوی سیاح نے اشارہ کیا ہے وہ دریائے کرشنا کے کنارے واقع تھیں۔ اور یہی گولکنڈہ کی کانیں مشہور ہوئیں جہاں سے نمک حرام محمد سعید میر جملہ نے لاثانی ہیرا "کوہ نور" اور اسی کے مماثل دوسرے ہیرے حاصل کئے اور پھر مغل بادشاہوں کے حوالے کئے۔

سنہ ۱۳۶۴ء تک گولکنڈے کی کوئی مستند تاریخ نہیں ملتی۔ مگر قلعہ کے آثار یہہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کم از کم اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ قلعۂ ورنگل جسکی تعمیر تیرھویں عیسوی کے وسط میں ہوی۔ گولکنڈہ دراصل مٹی کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کو راجایان ورنگل سے پہلے کسی ہندو شہزادے نے بنوایا تھا۔ ورنگل کا راجہ کورن کولا والی پوٹالمی حسب بیان جنرل کنگھم، کے لیتا اجاؤں کے سلسلے سے تھا جو درحقیقت چالوکیہ سلطنت کے ماتحت تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں اس خاندان نے تدریجی طور پر ترقی کی اور خود مختار ہو گیا۔

اس سلسلے کا پہلا بادشاہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۰۰ء میں برسر اقتدار تھا۔ سنہ ۱۳۲۱ء میں محمد بن تغلق شہنشاہ دلی نے ورنگل کی تسخیر کی۔ تغلق کے خیالی منصوبے جو اُس کی اپنی خود رائی اور ضد کا نتیجہ تھے صوبہ جات دکن میں سنہ ۱۳۴۳ء تا سنہ ۱۳۴۴ء تک بغاوتوں کا سبب بنے رہے۔ جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ ورنگل ایک بار پھر ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا۔ یہہ بے اعتدالیاں موقع بموقع علاء الدین بہمنی شاہ کیلئے بہمنیہ سلطنت کی تشکیل میں امداد رساں ثابت ہوئیں۔ بالاخر سنہ ۱۳۴۷ء میں علاؤالدین بہمنی نے شہنشاہ دلی سے دکن کا علاقہ الگ کر لیا۔

سنہ ۱۳۶۳ء میں ورنگل کے راجہ لدر دیو نے شہنشاہ دلی فیروز شاہ کو خط لکھا کہ وہ بہمنی بادشاہ محمد شاہ (سنہ ۱۳۵۸ء تا سنہ ۱۳۷۵ء) پر فوج کشی کرے۔ محمد شاہ بہمنی کو اس سازش کا علم ہوگیا۔ اور جب محمد شاہ نے اپنی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ کیں تو راجہ نے مجبور ہو کر بذریعہ عہد نامہ، گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے اضلاع بہمنی سلطنت کے سپرد کر دئے۔ اس واقعہ کے بعد سے سنہ ۱۵۱۸ء تک اس قلعہ کا شمار بہمنی سلطنت کے اہم قلعوں میں ہوتا تھا۔ اور اسی قلعہ کے ذریعہ سے تمام مشرقی حدود کی حفاظت اور مغرب میں فوجی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ یہی وہ واقعہ ہے جسکے بعد سے گولکنڈہ محمد شاہ بہمنی کے نام سے موسوم ہو کر قلعہ "محمد نگر" کہلایا جانے لگا۔ مورخین کو اس سے اختلاف ہے اور بعض کا خیال ہے کہ محمود شاہ بہمنی کے انتقال کے بعد (سنہ ۱۵۱۸ء) سلطان قلی نے گولکنڈہ کو "محمد نگر" سے موسوم کرکے اپنا پائے تخت قرار دیا۔ ہر بادشاہ کا اُس کے اپنے زمانے میں یہہ اصول رہا ہے کہ جو تعمیر اُس کے عہد میں ہوتی یا اُن مقامات کو جو اُس کے عہد میں اُس کے ہاتھوں فتح ہوتے اپنے نام سے موسوم کروا تا۔ قلعہ گولکنڈہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے محمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں بہمنی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ محمد شاہ بہمنی نے خود اس قلعہ کا نام "محمد نگر" رکھا ہوگا۔ نیز تاریخ شاہد ہے کہ لفظ "محمد" سلطان قلی کے نام کا جز نہیں۔ بنابریں اس روایت کو تسلیم کرنے میں

نال ہے کہ سلطان قلی نے اس قلعہ کو "محمد نگر" کے نام سے موسوم کیا ہے، لیکن عام طور پر سلطان قلی ہی کو گولکنڈہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

سلطان قلی کے ابتدائی حالات

سلطان قلی کے نسب کے متعلق تواریخ میں اختلاف ہے۔ ایک انگریزی تاریخ میں درج ہے:۔

سلطان قلی کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السّلام سے ملتا ہے، مگر شرقی تواریخ متفقہ طور پر اُس کا نسب نامہ اس طرح پیش کرتی ہیں۔ سلطان قلی بن اویس قلی بن امیرزادہ پیر قلی بن امیرزادہ الوند قلی بن سکندر قلی بن قرا یوسف بن قرا محمد (مرزا قرا محمد) بن امیر قرا تورسن (قرا یورس) بن قرا منصور (قرا منظور) بن امیر قرا بیرم بن قرا تورمش بن تورہ بیگ۔ اس کے بعد تین پشت تک سلسلہ منقطع ہے پھر اغرخاں بن قرا خاں۔

سلطان قلی سنہ ۸۶۰ھ میں اویس قلی کے ہاں مریم نامی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کے نانا ملک صالح نے اُس کا نام خاندانی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے سلطان قلی رکھا۔ اُس کی تعلیم اور بچپن کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔

خاندانی حالات سے مجبور ہو کر سلطان قلی نے اپنے چچا اللہ قلی (اعلیٰ قلی) اور چند رفقاء کے ساتھ ہمدان کو خیرباد کہا۔ اثنائے راہ میں اس چھوٹے قافلے نے بمقام یزد قیام کیا۔ سلطان قلی نے یہاں کے مشہور پیرِ طریقت بزرگ حضرت نور الدین نعمت اللہ شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فخرِ پابوسی حاصل کیا۔ چونکہ حضرت کی اہلیہ محترمہ سلاطین کے خاندان سے تھیں۔ بنابریں آپ نے سلطان قلی کی جانب خاص توجہ فرمائی اور رخصت کے وقت سفر کے لئے بکمالِ شفقت ارشاد فرمایا۔ "اے سلطان قلی تجھے ہند کا سفر مبارک، ملکِ دکن کا تو حاکم ہوگا" علاوہ بریں اپنی جانماز کے نیچے سے چند اشرفیاں نکال کر اُس کو دیں اور دعائیں دیکر رخصت کیا۔

سلطان قلی کا دکن میں وُرود

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان قلی کے دکن آنے کی خاص وجہ اُس کے اپنے خاندان کی تباہی تھی۔ گو وہ مجبور نہ تھا کہ اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہے۔ لیکن امیر یعقوب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مجبوراً اُسے ہمدان چھوڑنا پڑا۔ امیر یعقوب کو خاندان قرا یوسفیہ سے حد درجہ کینہ تھا۔ اور وہ نہ چاہتا تھا کہ اس خاندان کا کوئی فرد بقیدِ حیات رہے۔ سلطان قلی کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ بنابریں وہ مجبور تھا کہ ہمیشہ کے لئے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہے اور اپنے لئے ہمدان سے دور بہت دور ایک نئی دنیا بسائے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ہندوستان آچکا تھا مگر متعدد دیگر تواریخ کو اس سے اختلاف ہے۔ اتفاقِ رائے اس پر ہے کہ سلطان قلی اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ محمود شاہ بہمنی والیٔ بیدر کے دربار میں جسکی اُس زمانہ میں بہت شہرت تھی باریاب ہوئے۔ اور تحفے تحائف پیش کئے۔ محمود شاہ بہمنی نے انکی بہت آؤ بھگت کی اور خاندانی حالات سُنکر لطف و مہربانی کا برتاؤ کیا، اُنکی قدر و منزلت کی اور خلعت سے سرفراز کیا۔ رفتہ رفتہ شاہی دربار میں انھیں

کافی رسوخ اور تقرب حاصل ہو گیا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ سلطان قلی کی اُٹھان ایسی نہ تھی جو تھوڑی سی بلندی پر پہنچ کر رُک جاتی بلکہ اُسکی اُٹھان جیسا کہ ظاہر ہے معراج کمال کو پہنچی اور وہ ڈنکے بجائے کہ دنیا کے ہر قطعہ میں اسکی بہادری، دریا دلی، رعایا پروری، علم دوستی کے راگ گائے جانے لگے۔ محمود شاہ بہمنی کی نکتہ شناس نظر نے اُسے بھانپ لیا اور اپنا لیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ترکستان سے امیر یعقوب کے انتقال کی خبر آئی۔ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے یہ زرین موقع تھا کہ وہ اپنی حکومت دوبارہ قائم کر سکے۔ اس خبر کے سنتے ہی اللہ قلی، شاہ بہمنی کی خدمت میں باریاب ہوا اور واپسی کی اجازت چاہی۔ بادشاہ ان چچا بھتیجے کی قابلیت اور وجاہت سے اتنا مرعوب اور متاثر ہو گیا تھا کہ انھیں جانےکی اجازت دیتے ہوئے اُسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اللہ قلی کے اصرار پر بادشاہ نے اُسے تو اجازت دیدی لیکن سلطان قلی کو جس کا ارادہ خود بیدر سے جانے کا نہ تھا روک لیا اور اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔

حکومت کی ابتدا

سلطان قلی کی ترقی کا بڑا سبب اُسکی اپنی ذاتی قابلیت تھی۔ وہ ایک جید عالم، میدان کارزار کا بہترین سپاہی اور علم حساب کا زبردست ماہر تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اچھا خطاط بھی تھا۔ اُس کی حساب دانی کا اندازہ لگانے کے بعد محمود شاہ بہمنی نے اس کو حرم شاہی کا صدر محاسب مقرر کیا۔ سلطان قلی نے اپنے منصب مفوضہ کو بحسن تمام انجام دیکر شاہی محلات کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد تلنگانے سے خبر آئی کہ چوروں، ڈاکوؤں اور زمینداروں نے ظلم و ستم اور لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ اور رعایا مالگذاری ادا کرنے میں کوتاہی کر رہی ہے۔ یہ علاقہ محلات شاہی کی جاگیرات میں سے تھا۔ محلات شاہی چونکہ اُسکی دیانت اور وفا شعاری سے خوش تھے بنا بریں بادشاہ کے پاس سفارش کی گئی کہ سلطان قلی کو اس مہم کے سر کرنے کیلئے منتخب کیا جائے۔ بعض تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی خود اس بات کا خواہشمند تھا کہ اُسے اس کام کے لئے متعین کیا جائے۔ بادشاہ کی نظر انتخاب بھی اُسی پر پڑی اور وہ تلنگانے کے پُرآشوب پرگنوں میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجانے کے لئے صرف چند آدمیوں کے ساتھ کود پڑا۔ خلاف توقع ہر طرح کامیابی حاصل کی اور اکثر امراء اور زمینداروں کو نہ صرف اپنا ہمنوا بنایا بلکہ وفاداری اور بادشاہ پرستی کے وہ سبق سکھائے کہ مدت تک اُنھیں بغاوت و شورش برپا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سچ تو یہ ہے کہ یہی کامیابی اُسکی آئندہ بادشاہت کا پیش خیمہ تھی اور کیوں نہ ہوتی جبکہ حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کی خاص توجہ اور دعائیں اُس کے ساتھ تھیں۔ سلطان قلی نے چند ہی دنوں میں تلنگانہ کا انتظام پورا کیا۔ اور پایۂ تخت بیدر کو واپس آیا۔ محمود شاہ نے اس کی کارگذاری اور بہادری سے خوش ہو کر امیر الامراء خواص خاں کا خطاب عطا کیا۔ اتفاق وقت بلکہ بخت کی یاوری کہیئے کہ ان دنوں قطب الملک دکنی جو تلنگانے کا صوبہ دار تھا، جام کھنڈی کے معرکہ میں کام آیا۔ بادشاہ نے سلطان قلی کو قطب الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا، تلنگانے کی صوبہ داری دی

اور گولکنڈہ اور ورنگل جاگیر میں عطا کئے۔ یہی وہ خطاب ہے جو نہ صرف سلطان قلی بلکہ اُس کے جانشینوں کا بھی طرۂ امتیاز رہا اور اسی خطاب کے سائے میں انھوں نے جیسی کچھ شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اظہر من الشمس ہے۔

یہ بدیہی امر ہے کہ بادشاہ جب ملک اور سیاست سے بےخبر ہو جاتا ہے تو امراء اور حکام ذاتی اغراض اور نفع کی خاطر بد دیانتی اور خیانت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اُنکو نہ تو رعایا کی بہبودی کا خیال رہتا ہے اور نہ سرکار کی خیر خواہی کا گو ان کا محسن آقا اُن پر کتنا ہی مہربان کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود بہمنی کا عہد حکومت سیاسی انتشار کا زمانہ تھا جو بہمنی سلطنت کے خاتمہ کا باعث ہوا۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ بھی کہ ملک میں بیرونی لوگوں کا آئے دن تانتا لگا ہوا تھا۔ سلاطین بہمنیہ چونکہ علم دوست بادشاہ تھے اس لئے انھیں اس کا خیال بھی نہ ہوا کہ یہی بدیسی اُن کی سلطنت کے زوال کا باعث ہونگے۔ . . . .

اجنبیوں کا رسوخ . . . .

بڑھتا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے بہادر، اس کے مایۂ ناز اور حقیقی فرزند جنھوں نے خون پسینہ ایک کرکے دکن کی کھیتی سینچی اور جنھوں نے اپنی ہڈیاں سلطنت کے پائے میں دیکر دکن جیسی مضبوط، پہاڑ کی طرح اٹل حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور جو حقیقی معنوں میں سلطنت دکن کے معمار تھے، کس مپرسی کی حالت میں آگئے، اُن کی اولاد بے یار و مددگار ہوگئی۔ اُن سے کوئی جھوٹے منہ یہ بھی نہ پوچھتا کہ تم کون ہو؟ تمہارے حقوق کیا ہیں؟ اور تم کیا چاہتے ہو؟ اپنے بھی پرائے ہوگئے تھے۔ بادشاہ کا دربار اجنبیوں سے پُر تھا، پھر ان کی رسائی اور شنوائی ہوتی تو کس طرح! ان حالات نے سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اس پر بھی محمود شاہ نہ جاگا اور ان غرض پرست بدیسیوں پر بھروسہ کئے رہا جنکو خود اُس نے اپنے ہاتھوں امارت اور حکومت کی کرسیوں پر بٹھایا تھا۔ باہر والوں نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور اپنے صوبوں میں خود مختار سلطنتیں قائم کرلیں۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ سلطان قلی نے بھی دوسرے صوبہ داروں کی طرح محمود شاہ بہمنی کی زندگی ہی میں قطب شاہ کے لقب سے گولکنڈہ میں اپنی خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ظاہر ہے کہ سیاسی انتشار فطرتاً کسی مرکزیت کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ اس لئے بہمنی سلطنت کی کمزوری کے زمانے میں جبکہ لوٹ مار، جدال و قتال، شورشوں اور بغاوتوں کی چاروں طرف ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں سلطان قلی کا داخلی مفاد کے لئے اپنی قوت اور طاقت پر اعتماد کرکے بادشاہت کا اعلان کر دینا گویا تقاضائے وقت تھا۔ اور یہ ایک ایسی اہم ضرورت تھی جسکی رسمی تکمیل کو غالباً ہر مدبر تسلیم کریگا۔ مگر اس کے برخلاف سلطان قلی نے اپنے مربی اور محسن بادشاہ کی زندگی تک کبھی اس خیال کی پرورش اپنے دل میں نہ کی کہ وہ خود مختار ہو جائے۔ حالانکہ دوسرے صوبہ داروں نے جو خود مختار ہو چکے تھے کئی شاہی علاقے ہضم کر لئے اور سلطان قلی کو بھی ترغیب دی کہ شاہی علاقوں پر قبضہ کرکے اپنی مملکت کو وسیع کرے

اور خود مختار ہو جائے۔ مگر سلطان قلی نے گو کہ اُس کا شمار بھی اجنبیوں میں تھا۔ اس حرکت کو سخت ترین بے وفائی اور نمک حرامی خیال کیا۔ اُسکی انتہائی وفاداری اور شرافت کی بہترین شہادت گولکنڈے کی جامع مسجد (مسجد صفا) کے کتبے سے ملتی ہے۔

یہ مسجد سلطان قلی نے ۹۲۴ھ میں بنائی ہے اور یہی محمود شاہ بہمنی کی زندگی کا آخری سال ہے۔ اس کے کتبے میں وہ نہایت احترام کے ساتھ محمود شاہ بہمنی کا نام لکھ کر مسجد کے اس کے عہد میں تعمیر کئے جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخیں شاہد ہیں کہ وہ محمود شاہ بہمنی کی زندگی تک سالانہ پانچ ہزار ہُون بطور نذرانہ یا خراج ادا کیا کرتا تھا۔

بہر نوع ۱۵۱۸ء میں گولکنڈہ کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قائم ہوی۔ بنیاد رکھنے والے کے پیش نظر ملک کی فلاح و بہبود، رعایا کے آرام اور علم کی سرپرستی کا خاص خیال تھا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوے نہ صرف سلطان قلی بلکہ اُسکی اولاد نے بھی اس سرزمین پر انتہائی آن بان اور شان و شوکت سے حکومت کی اور تہذیب و تمدن، علم و فضل، دولت و ثروت اور شعر و سخن کے دریا بہا دئے۔ پرانے قلعہ کو جو صرف مٹی کا تو دا تھا۔ سلطان قلی نے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوے مضبوط کر لیا۔ قلعہ سے باہر مضبوط اور مستحکم فصیل بنوائی۔ اندرون شہر بازار اور باغات لگوائے۔ کئی خوشنما عمارات اور محل تعمیر ہوے مسافروں کے لئے مسافر خانے تعمیر کئے گئے۔ غرض وہ سب کچھ کیا گیا جو ایک بارونق اور متمدن شہر کے لئے کیا جاسکتا ہے۔ قلعے کی تعمیر سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے متعدد قلعے فتح کئے جن کا شمار دکن کے مضبوط قلعوں میں ہوتا تھا اور اُن پر لائق، محنتی، دیانت دار اور وفا شعار افراد مامور کئے۔

سلطان قلی قطب شاہ نے تقریباً ساٹھ سال دکن کی سیاسی خدمت کی جنہیں تقریباً چھبیس سال خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے گذارے۔ بالآخر ۲ رجادی الثانی سنہ ۹۵۰ھ دکن کے اس جلیل القدر بادشاہ نے انتقال کیا۔ اُسکی موت اُسکے اپنے بیٹے جمشید قلی کے اشارہ سے واقع ہوی۔ اُس وقت سلطان قلی اپنی بنائی ہوی جامع مسجد (مسجد صفا) میں نماز ادا کر رہا تھا اور اُسی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ سلطان قلی اپنے پیچھے ایسی یادگاریں چھوڑ گیا جنکی حرماں نصیبی اور بے بسی سیاحت کرنے والوں کے لئے انتہائی عبرت اور دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اور یہ یادگاریں آج بھی لوگوں کی زیارت گاہ بنی ہوی ہیں اور شاید رہتی دنیا تک یہی حال رہیگا۔

صلابت اللہ خاں
متعلم سال اول

اسلامی مملکتیں اور اُن کے فرمانروا

ترکی :۔ عثمانی بادشاہت اور جنگِ عظیم کے اختتام پر یہاں جمہوریت قائم ہوئی۔ چنانچہ اسی جمہوریت نے ۱۹۲۳ء میں انگورہ کو اپنا پایۂ تخت مقرر کیا۔ اب ترکی کی آبادی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ لیکن ۱۹۲۳ء کی مردم شماری کی رُو سے کل آبادی ۲۰ ملین ہے باشندے ترک مسلمان ہیں۔ ستر ہزار رومن ہیں۔ چند یہودی بھی قدیم پایۂ تخت میں رہتے تھے۔ لیکن انھیں یہاں سے نکال دیا گیا۔ اس جمہوریت کے پہلے صدر غازی مصطفےٰ کمال تھے۔ جنکی بیش بہا خدمات کو ترکی کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ انھیں کی اُن تھک کوششوں نے ترکی کو دشمنوں سے نجات دلائی۔ انکی وفات کے بعد عصمت انونو صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

مصر :۔ یہ ایک وسیع سلطنت ہے۔ اور اسلامی مملکتوں میں نہایت تہذیب یافتہ ہے رقبہ (۳۹۴۹۴) مربع کیلومیٹر ہے ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی (۱۴۱۷۹۰۰۸) نفوس پر مشتمل ہے جن میں (۸۵۴۷۷۸) قبطی (۱۰۸۵۰۹) یہودی (۶۹۷-۱۱۰) رومن کیتھولک (۱۸۴۸۴) پروٹسٹنٹ (۱۴۴۱۶) دیگر اقوام عیسائی (۱۱۲۰۰۰) اجنبی ممالک کے باشندے اور باقی تمام آبادی مسلمانوں کی ہے۔

تختِ مصر کے مالک جلالۃ الملک شاہ فاروق ہیں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے ۱۹۲۲ء کو والد مرحوم نے دربار میں انکو ولی عہد سلطنت مقرر کیا۔ اور تمام ملک نے اس اعلان کو تسلیم کر لیا۔ عربی اور دینیات کی تعلیم خاص استادوں کی نگرانی میں حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا ایک انگریز خاتون مس نیلور کی نگرانی میں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں رائل ملٹری اکاڈمی "دلوچ" میں داخلہ کی غرض سے روانہ ہوئے۔ کمسنی کے باعث کالج میں داخل نہ ہو سکے۔ لیکن ماہرانِ فن سے استفادہ حاصل کیا۔ کالج میں داخل ہونے کے قابل ہوئے تو والد ماجد کی وفات واقع ہوئی۔ چار و ناچار واپس ہونا پڑا۔ چونکہ انکی عمر اٹھارہ سال سے کم تھی اس لئے عنانِ حکومت کونسل آف ریجنسی کے سپرد رہی۔ اس کے بعد خود سلطنت کے کاروبار کو سنبھال لیا۔ اب مصر آزادی

کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ دو سال کا عرصہ ہوا مصر کے تمام دفتری کاروبار انگریزی سے عربی میں منتقل ہو گئے۔

ایران:۔ ایشیائے وسطیٰ کے بڑے اسلامی ممالک میں شمار کیا جاتا ہے آبادی پندرہ ملین ہے۔ رقبہ (۱۶۱۸۸۸۸) مربع کیلو میٹر ہے۔ طہران یہاں کا پایۂ تخت ہے۔ داخلی اور خارجی معاملات میں یہ خود مختار ہے۔ یہاں کا بادشاہ شہنشاہ کہلاتا ہے کسی غیر ملکی حکومت کا یہاں پر اقتدار نہیں۔ البتہ شاہ قاچار کے عہد حکومت تک انگریز اور روسیوں نے اندرون ملک کچھ اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ موجودہ شہنشاہ نے اس کو بالکلیہ نیست و نابود کر دیا۔

شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی ہیں انھوں نے اپنے تدبر سے ایران کو حیاتِ نو بخشی سنہ ۱۸۷۸ء کو بمقام داشت جو سواد کوہ میں واقع ہے پیدا ہوئے۔ زمانہ کے انقلاب نے انھیں سپاہی کے درجہ سے شہنشاہ کے درجہ تک پہنچا دیا سنہ ۱۹۲۵ء کو مجلس شوریٰ ایرانیہ نے بالاتفاق رائے ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

افغانستان:۔ بڑی اسلامی سلطنتوں میں شمار ہوتی ہے۔ غیر ملکی حکومت کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ خود مختار ہے۔ پایۂ تخت کابل ہے۔ رقبہ (۷۹۶۵۲۱) مربع کیلو میٹر ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اسکی آبادی بارہ ملین نفوس پر مشتمل ہے لیکن اس کے علاوہ چھ ہزار افغانی ہندوستان میں بھی مقیم ہیں۔ غیر ملکی اقوام میں صرف یہودی ہیں۔ اور انکی آبادی تین ہزار ہے۔ ان کا زیادہ تر قیام ہرات میں ہے۔ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان پشتو ہے۔ جو قدیم آریائی زبان کی ایک شاخ ہے۔ لیکن شمالی آبادی کی زبان چغتائی ہے۔ فارسی زبان بھی بکثرت مروج ہے اور دفتری کاروبار فارسی زبان میں ہوتے ہیں۔ یہ ایک زراعتی ملک ہے۔

محمد ظاہر شاہ ابن نادر شاہ یہاں کے فرمانروا ہیں۔ افغانستان کا انقلاب اور امان اللہ خاں کی جلاوطنی ایسے مشہور واقعات ہیں جن کے لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ظاہر شاہ سنہ ۱۹۱۴ء میں دارالسلطنت کابل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب عالی حبیبیہ میں ہوئی۔ جب کالج کی تعلیم کے قابل ہوئے تو حسن اتفاق سے آپ کے والد حکومت افغانستان کی جانب سے فرانس میں سفیر مقرر ہوئے۔ اس لئے والد ہی کے ہمراہ حصولِ علم کی غرض سے راہی فرانس ہوئے۔ فرانس میں ایک اسکول " رینہ جان من " میں داخل ہوئے۔ دو سال تک اس اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ اسکے بعد والد کے ہمراہ جنوبی فرانس میں ڈیڑھ سال تک مقیم رہے۔ پھر پیرس آئے اور " پاستور " اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ اسی اثنا میں افغانستان میں بغاوت پھوٹ پڑی آپ کے والد فوراً افغانستان چلے آئے تاکہ کسی ممکنہ طریقہ سے بغاوت کو فرو کریں۔ مگر والد کے حکم سے یہ فرانس ہی میں مقیم رہے۔ اور تعلیم جاری رہی آپنے رومون پیلیے کالج سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ جب بغاوت فرو ہوگئی تو آپ وطن واپس ہوئے اور حربیہ کالج میں داخل ہوگئے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مزاراتِ حربیہ کے ذمہ دار عہدہ پر اپنے چچا کے قائم مقام رہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں آپ کے والد نادر شاہ شہید نے کابل کے حبیبیہ اسکول میں طالب علموں کو انعامات عطا فرماتے ہوئے ایک شخص عبد الخالق نامی کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا سنہ ۱۹۳۳ء میں روساء اور امراء

نے ناصر شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

عراق:۔ ملک عرب کا ایک قطعہ ہے جو جنگ عظیم کے بعد حکومت عثمانیہ کے اقتدار سے علیحدہ ہو گیا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے خلافت عباسیہ کے دور میں ایک ممتاز ملک رہا ہے۔ اسوقت بھی اس کا پایۂ تخت بغداد تھا جو اس زمانے میں تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ بلحاظ زراعت، سرسبزی و شادابی اور آب و ہوا کے اچھا ملک ہے۔ رقبہ (۱۰۵۲۲۵) مربع میل ہے۔ اب بھی بغداد پایۂ تخت ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی (۳۸۴۹۲۸۲) نفوس پر مشتمل ہے۔ جن میں یہودی اور عیسائی بھی شامل ہیں۔

غازی ملک بادشاہ حال ہیں۔ یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن حکیم عربی اور عربی صرف و نحو کی تعلیم پائی۔ سنہ ۱۹۲۲ء کو بغداد آئے اور انگریزی تعلیم حاصل کی سنہ ۱۹۲۶ء میں حصول علم کی غرض سے انگلستان روانہ ہوئے۔ کالج میں تقریباً ڈھائی سال رہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں بغداد آئے اور حربیہ کالج میں داخل ہو گئے۔ کالج میں اپنی زندگی دوسرے اور طالب علموں کی طرح بسر کرتے رہے۔ اپنا ڈریس، ہتھیار وغیرہ خود صاف کیا کرتے۔ ان کے والد مرحوم شہنشاہ جارج پنجم کے دعوت کرنے پر سنہ ۱۹۳۳ء ۵ جنوری کو انگلستان تشریف لے گئے اور انھیں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس کے بعد ۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء کو پھر سوئزرلینڈ تشریف لے گئے اور انھیں اپنا قائم مقام بنایا۔ اسی اثنا میں سوئزرلینڈ میں انکا انتقال ہو گیا۔ اور سنہ ۱۳۵۲ ہجری میں مستقل طور پر یہ عراق کے فرمانروا ہو گئے تھے۔ کمسن بچہ ان کا جانشین ہے۔

نجد:۔ علاقۂ عرب میں سب سے زیادہ طویل و عریض مملکت ہے۔ لیکن آبادی کم ہے۔ سرکاری طور پر مردم شماری کا انتظام نہیں کیا گیا۔ البتہ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ آبادی پانچ ملین نفوس پر مشتمل ہے۔ اسی طرح رقبہ کی بھی سرکاری طور پر پیمائش نہیں ہوئی، اس کے متعلق بھی قیاس آرائیوں سے کام لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رقبہ تقریباً چھ لاکھ مربع میل ہے آمدنی کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ اکثر لوگ تجارت پیشہ بھی ہیں۔ دارالحکومت مکہ معظمہ ہے جہاں ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے لاتعداد مسلمان بغرض حج آتے جاتے رہتے ہیں۔

عبدالعزیز السعود یہاں کے فرمانروا ہیں سنہ ۱۸۸۰ء کو شہر ریاض میں پیدا ہوئے۔ دوسرے بھائیوں کے ساتھ انکی بھی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جب یہ سن بلوغ کو پہنچے تو آل رشید سے جنگ چھڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آل رشید غالب آ گئی۔ آپ کے والد کو معہ اپنے اہل و عیال کے فرار ہو جانا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے حاکم کویت کے پاس پناہ لی۔ اتفاق سے حاکم کویت اور آل رشید میں جنگ چھڑ گئی۔ اور یہ ایک فوج کے سپہ سالار بھی تھے۔ بدقسمتی سے حاکم کویت کو سخت شکست اٹھانی پڑی۔ لیکن انکی فوجی قابلیت اور بہادری نے آل رشید کو مار بھگایا اور یہ دوبارہ اپنے علاقوں پر قابض ہو گئے سنہ ۱۹۲۱ء میں حایل کی حکومت شامل کر لی گئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں جدہ پر قبضہ ہوا۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۹ء میں سارے حجاز کے امرا و روسا نے انکے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یمن:۔ عربی ممالک کا ایک صوبہ ہے۔ جو جنگ عظیم کے بعد ترکی کے اقتدار سے نکل گیا۔ یہ ملک بالکل آزاد اور

خود مختار ہے۔ یہاں کے باشندے اپنے بادشاہ کو امیر المومنین کہتے ہیں۔ سرکاری طور پر مردم شماری نہیں کی گئی لیکن قیاسا کہا جا سکتا ہے کہ آبادی تین یا چار ملین نفوس پر مشتمل ہے۔ اسی طرح رقبہ بھی پچاس ہزار مربع میل ہے۔ پہاڑی علاقوں پر میوہ جات [illegible] پیدا [illegible] ہیں۔

یہاں کے [illegible] [illegible] [illegible] پیدا ہوئے۔ انھوں نے مدارس میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ علماء و فضلاء سے اسلامی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ۱۳۲۲ھ میں ان کے والد کا انتقال ہوا۔ والد نے اپنی زندگی میں کوئی ولی عہد مقرر نہیں کیا تھا اس لئے کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ یحییٰ حمید الدین کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ اس لئے کہ وہ اس کے ہر طرح سے اہل ہیں۔ پہلے پہل انھوں نے اس بار عظیم کو قبول کرنے سے انکار کیا لیکن کمیٹی اور روساء کے اصرار پر قبول کر لیا۔

ٹیونس:۔ شمالی افریقہ کی یہ ریاست [illegible] فرانس کے ماتحت ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کی رو سے (۲۱۵۹۷۰۹) افراد پر مشتمل ہے۔ رقبہ (۱۲۵۰۰۰) مربع کیلو میٹر ہے۔ ٹیونس پایہ تخت ہے۔ زراعتی ملک ہے۔ اور معدنیات کی کثرت ہے۔ یہاں کے بادشاہ کو "بائی" کہا جاتا ہے۔

اس طرح موجودہ بائی احمد بن علی بیگ ہیں ۱۳۷۰ھ میں مرسیٰ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں ولی عہد مقرر ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں تخت سلطنت کو زینت بخشی۔

جمہوریہ سوریہ:۔ جنگ عظیم کے بعد جس طرح اور ممالک ترکی سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی طرح سوریہ نے بھی اپنی علیحدہ حکومت قائم کی۔ کچھ عرصہ بعد فرانسیسی اس پر قابض ہو گئے۔ اسکو پانچ صوبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) حکومت دمشق (۲) حکومت لبنان (۳) حکومت جبل الدروز (۴) حکومت العلویین (۵) حکومت اسکندرونہ

یہ تمام حکومتیں دمشق میں واقع ہیں۔ جنکو جمہوریہ سوریہ کہتے ہیں منصب صدارت پر ایک مسلم رئیس فائز ہیں۔ آبادی پندرہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور رقبہ (۱۲۷۰۰۰) مربع کیلو میٹر ہے۔ دمشق پایہ تخت ہے۔

رئیس جمہوریہ سوریہ محمد علی العابد ہیں ۱۸۶۷ء میں ملک شام میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد عزت پاشا سلطان عبد الحمید کے سکریٹری تھے۔ ابتدائی تعلیم دمشق کے مدرسہ میں حاصل کی اور پھر بیروت کے کالج سے سند حاصل کی۔ اس کے بعد حصول علم کی غرض سے پیرس چلے گئے۔ وہاں "لا" کالج میں داخل ہو کر قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے انھوں نے دربار ترکی میں خاص رسوخ پیدا کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں بطور ترکی سفیر واشنگٹن روانہ کئے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں شام پہنچے۔ جب ۱۹۲۲ء میں فرانس کی جانب سے نئی تشکیل عمل میں آئی تو وزیر مالیہ مقرر ہوئے۔ ایک سال تک اس منصب پر فائز رہے ۱۹۳۲ء کو جمہوریہ سوریہ کے صدر منتخب ہوئے۔

لحج:۔ ان علاقوں میں سے ہے جو انگریزوں کے قبضہ میں ہیں۔ یمن کے جنوب میں واقع ہے۔ آبادی ایک لاکھ

نفوس پر مشتمل ہے۔ موکلا پایۂ تخت ہے۔ کئی بندرگاہ بھی ہیں۔

یہاں کے حکمراں سلطان عبدالکریم بن علی الحسن فضل العبدالی ہیں سنہ ۱۳۰۹ ہجری میں پایۂ تخت موکلا میں پیدا ہوئے عربی زبان خصوصاً صرف و نحو میں مہارت حاصل ہے۔ انگریزی بھی آتی ہے۔

مغرب الاقصیٰ :- شمالی افریقہ میں واقع ہے۔ یہ مملکت تین حصوں میں منقسم ہے۔ جن میں فرانسیسی اسپین اور خود یہاں کے سلطان ہیں۔ رقبہ پانچ لاکھ بیس ہزار مربع کیلومیٹر ہے جس میں چار لاکھ پندرہ ہزار مربع کیلومیٹر فرانس کے قبضہ میں ہے۔ باقی اسپین اور سلطان کے ماتحت ہیں۔ ملک کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے۔ رباط الفتح دارالحکومت ہے۔

یہاں کے حکمراں سلطان محمد بن یوسف ہیں۔ اصلی وطن ینبع حجاز تھا لیکن سنہ ۱۹۶۴ء میں ان کے آباؤ اجداد مغرب الاقصیٰ چلے آئے۔ عربی اور فرانسیسی دونوں زبانوں پر حاوی ہیں۔

شرق الاردن :- حکومت دمشق فیصل کے خاتمہ پر جنوبی دمشق میں سنہ ۱۹۲۱ء میں حکومت شرق الاردن قائم ہوئی۔ رقبہ چالیس ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ آبادی تین لاکھ اٹھاون ہزار ہے جن میں تیس ہزار عیسائی قابل الذکر ہیں۔ عمان پایۂ تخت ہے۔ شرق الاردن حکومت برطانیہ کے تحت ہے۔

حکومت کے صدر امیر عبداللہ بن حسین ہیں سنہ ۱۲۹۹ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ترکی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ بہادر اور جری سپاہی ہیں شرق الاردن کی طوائف الملوکی کے دوران میں بعض ان کی بیش بہا خدمات کا معترف ہے۔

حضر موت :- یمن کی نو آبادیات میں سے ہے۔ جو علحدہ ہو کر ایک صوبہ کی صورت میں انگریزوں کے زیر اثر ہے۔ رقبہ بارہ لاکھ مربع کیلومیٹر اور آبادی دو لاکھ ہے۔ یہاں دو حکومتیں ہیں پہلی حکومت کا پایۂ تخت مکلا۔ اور دوسری حکومت کا پایۂ تخت سیئون ہے۔ یہاں کے باشندے قدیم تمدن کے حامل ہیں تجدید خمیر کے آثار قدیمہ کافی شہرت رکھتے ہیں کسی اجنبی کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

سلطان صالح بن غالب یہاں کے فرمانبردار ہیں سنہ ۱۲۹۰ھ میں ریاست حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ آپ حیدرآباد دکن کی عربی افواج کے قائد اعظم ہیں سنہ ۱۹۳۶ء میں آپ کے چچا زاد بھائی کا انتقال ہوا۔ یہاں کا یہ دستور ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے آدمی کو تخت نشین کیا جاتا ہے۔ اس لئے آپ تخت نشین کئے گئے۔

مسقط :- ہندوستان کے قریب خلیج فارس میں ایک عربی سلطنت ہے۔ انگریزوں کے زیر اثر ہے۔ رقبہ ایک لاکھ چالیس ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ یہ زرخیز ملک ہے اور معدنیات کی کثرت ہے۔ مسقط پایۂ تخت ہے۔

موجودہ سلطان سعید بن تیمور البوسعید ہیں۔ مسقط میں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم یہاں حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کے لئے ہندوستان آئے اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں بغداد گئے اور عربی تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ان کے والد ہندوستان آئے اور انھیں ولی عہد سلطنت مقرر کیا۔ اور خط کے ذریعہ رعایا کو معلوم کرایا کہ بیماری کی وجہ سے وہ نہیں آ سکتے اس لئے اہل ملک کو وصیت کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔

کویت:- خلیج فارس میں انگریزوں کے زیر اثر ایک چھوٹی سی عربی حکومت ہے۔ کویت اس کا پایۂ تخت ہے۔ موتیوں کی تجارت زیادہ ہوتی ہے۔ غواصی میں اہل کویت ماہر ہیں۔ آبادی ایک لاکھ بیس ہزار ہے اس کے علاوہ ملحقہ البانیوں کی آبادی چالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

شیخ احمد الجابر آل صباح یہاں کے حکمراں ہیں سنہ ۱۸۸۹ء میں کویت میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۳۳۹ میں جب ان کے چچا کے لڑکے کا انتقال ہوا تو یہ تخت نشین ہوئے۔

بحرین:- مجمع الجزائر خلیج فارس میں واقع ہے۔ حکومت برطانیہ کے زیر اثر ہے۔ رقبہ پانسو باون مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی دو لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ تجارت کے اعتبار سے انکی اہمیت زیادہ ہے۔ موتیوں کی برآمد زیادہ ہوتی ہے۔ محرّق پایۂ تخت ہے۔ اور سب سے بڑا جزیرہ منامہ ہے۔ جس کی آبادی چالیس ہزار ہے۔ یہ تجارتی مرکز اور دار الحکومت ہے۔

امیر بحرین شیخ احمد بن عیسیٰ ہیں۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں محرّق میں پیدا ہوئے۔ صرف عربی زبان جانتے ہیں سنہ ۱۹۲۳ء تک بحرین کمل طور سے ان کے قبضہ میں تھا۔ لیکن بعد میں انگریزوں نے ان کا اقتدار چھین لیا۔ اور ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

حیدرآباد دکن:- ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ ثروت و اقبال میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل ہے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے آبادی (۱۲۶۹۲۹۰۳) نفوس پر مشتمل ہے۔ سلطنت میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔

یہاں کے حکمراں ہز اکزالٹیڈ ہائینس نواب میر عثمان علیخاں بہادر ہیں سنہ ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں کے علاوہ ملکی زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ حیدرآباد کی موجودہ ترقیاں آپ ہی کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

محمد صفی الدین صدیقی
جماعت دہم

آج کل کے اردو نثر پیشرو

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ان کا خاندانی سلسلہ نسب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے۔ یہاں فوج کے ایک معزز عہدے پر سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے بعد ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہونچے۔ چند روز بعد حیدرآباد میں تشریف فرما ہوکر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سواروں کی جمعیت کے ملازم رہے۔ لیکن خانگی مجبوریوں کی بنا پر ملازمت سے مستعفی ہوکر ہندوستان واپس چلے گئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور چار سال بعد ان کے والد الور میں معمولی حادثے میں مارے گئے۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں صوبہ دار اکبرآباد نے ان کی سرپرستی کی لیکن غالب نو سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ بھی کسی معرکہ میں کام آئے۔ وہ امیرزادہ جو شاہانہ دل و دماغ لیکر آیا تھا۔ اسکو صرف ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کرکے زندگی بسر کرنی پڑی۔ ان کی جاگیر وغیرہ کا حصہ دوسروں نے دبا لیا اور غالب مقدمہ دائر کرنے پر بھی ہار گئے۔ دلّی کی تباہی کے بعد ان پر زیادہ مصیبت پڑی۔ اس وقت رامپور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب رامپور نے سو روپیہ ماہانہ مقرر کردیا۔ مگر مرزا وہاں زیادہ نہ رہ سکے پھر دلی واپس آئے۔ وہ اردو کے باکمال شاعر تھے۔ فارسی انکی مادری زبان نہ تھی مگر اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ اس زبان کے مسلّم الثبوت استاد ہو گئے۔ تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک انتخابی دیوان ہے جو ۱۸۴۹ء میں مرتب ہوکر چھپا۔ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کے کلام کی اہم خصوصیت ہے۔ چونکہ مرزا کی فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اُس سے انہیں طبعی تعلق تھا۔ اسلئے اکثر فارسی الفاظ سے ترکیب دیتے تھے۔

اردو زبان ان [illegible] ہو گئی۔

اُردو زبان میں ان کے رقعات کے دو مجموعے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ ایک عودِ ہندی اور دوسرے اردوئے معلّٰی ان خطوط کی عبارت مکالمے کی طرح ہے۔ اس میں بھی فارسی کی ترکیبیں اور محاورے استعمال کئے ہیں ان خطوط کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے۔ زبان میں ظرافت اور لطافت کی شوخیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مرزا نے (۷۳) تہتر برس کی عمر پاکر ۱۸۶۹ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر | پیدائش دہلی ۱۸۱۷ء   وفات علی گڑھ ۱۸۹۸ء

سر سید ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم رسمیہ کی تحصیل کے بعد (۲۲) سال کی عمر میں ابتداءً دہلی کے صدر امین کی کچہری میں سررشتہ دار مقرر ہوئے اس کے بعد کمشنری آگرہ میں نائب منشی ہوئے ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف ہوئے۔ وہاں سے فتح پور سیکری اور پھر دہلی آئے۔ ۱۸۵۵ء میں بجنور کے مستقل صدر امین ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کے سب جج مقرر ہوئے۔ تبادلوں کے سلسلے میں غازی پور۔ علی گڑھ۔ بنارس میں سب ججی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یکم اپریل ۱۸۶۶ء کو بنارس سے ولایت روانہ ہوتے۔ ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے۔ اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ کے دربار سے آپ کو جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب ہوا۔

۹ اگست ۱۸۶۹ء کو سرکار انگلیشیہ سے سی۔ آئی۔ کا خطاب اور تمغہ ملا ۱۸۷۶ء میں وظیفہ لیکر اپنی زندگی کو اپنی قوم کے لئے وقف کر دیا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو بمقام علی گڑھ اکاسی برس کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اور اپنے قائم کئے ہوئے کالج کی مسجد کے بیرونی حصے میں دفن ہوئے۔

سر سید نے ۱۷ سترہ، ۱۸ اٹھارہ برس کے سن سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک قدیم طرز میں لکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آپ نے اپنی تحریر کا رنگ بالکل بدل دیا۔

سر سید کے کلام میں تشبیہیں۔ استعارے۔ کنائے۔ مثلیں۔ تلمیحیں۔ نہایت لطیف ہیں۔ ندرتِ بیان حد سے زائد ہے۔ سر سید کے قلم میں ہر مطلب کو اُسکے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی بیحد قابلیت تھی۔ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جاتے کہ بڑے سے بڑا مفہوم چھوٹے سے جملے میں ادا ہو جاتا۔ واقعات اور حالات کے حُسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش ہو جاتیں۔ مولانا حالی اپنی کتاب حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ "سر سید نے اردو زبان اور اردو لٹریچر کو طرح طرح کی مدد پہونچائی ہے۔ گرجو بے بہا مدد خاصکر ان کے لٹریری ورکس سے اردو لٹریچر کو پہونچی ہے۔ اُس کے لحاظ سے اُنکو "فادر آف اردو" کہنا کچھ مبالغہ نہیں۔" سر سید کی تحریر کو لوگ شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے۔ اور اُس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک

کے دل میں ویسی ہی اردو لکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے جو صفائی اور سلاست اور شائستگی اور گھلاوٹ عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ اور مضمون نگاری کا جو سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے۔ یہ سب اسی ایک نام کی آواز بازگشت ہے۔ سب سے زیادہ زوردار اور باثر آپ کی سیاسی اور مذہبی تقریریں ہوئیں۔ علمی تصانیف سے سلسلہ احمدیہ۔ آثار الصنادید۔ اسباب بغاوت ہند۔ لکچروں کا مجموعہ اور صدہا مفید مضامین وغیرہ آپ کی یادگار ہیں۔ جو ان کے جاری کردہ اخبار تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپے ہیں۔

خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر

ان کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر کے رہنے والے تھے اور مغلیہ دربار میں ان کے بزرگ عہدہائے قضاۃ کشمیر پر مامور ہوئے۔ ان کے والد خواجہ حضور اللہ ترک وطن کرکے تبت چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت اختیار کرلی۔ چنانچہ بیخبر سنہ ۱۲۴۰ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ انکی چار برس کی عمر تھی۔ ان کے والد اور نانا کو گردش زمانہ نے پھر ترک وطن پر مجبور کیا۔ اور اس مرتبہ بنارس میں طرح اقامت ڈالی۔ یہیں سن شعور کو پہونچے۔ اور تعلیم کا سلسلہ تکمیل کو پہونچا۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب کے نائب مقرر ہوئے۔ انھیں ایام میں جب لارڈ الن برو نے گوالیار پر چڑھائی کی تو یہ گورنر جنرل کے منشی خانے کے ساتھ اس مہم میں شریک ہوئے۔ اور جنگ کے خاتمہ پر بصلۂ کارگزاری خلعت پایا۔ پھر کئی سال بعد اپنے خالو کی بجائے میر منشی مقرر ہوئے۔ اور سنہ ۱۸۸۵ء تک برابر اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے اور اپنے حکام میں اعتبار اور وقار حاصل کیا۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں خیرخواہی کے صلہ میں سند و خلعت ہفت پارچہ مرحمت ہوا۔ ملکہ معظمہ کے خطاب شاہی اختیار کرنے کے موقعہ پر آپ کو تمغۂ قیصری ملا۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں (۴۵) سال کی ملازمت کے بعد آپ وظیفہ پر علیحدہ ہو گئے۔ اور خان بہادر ذوالقدر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

غالب مرحوم سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ خطوط کا طرز تحریر نہایت دلکش تھا۔ آپ کی تصنیفیں خونابۂ جگر، فغان بیخبر، یادگار ہیں۔ آپ نے پیرانہ سالی میں انتقال فرمایا۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد پیدائش دہلی سنہ ۱۸۳۱ء .... وفات لاہور سنہ ۱۹۱۰ء

آزاد مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ جو شیعوں کے مجتہد اور شرفائے دہلی میں ایک نامور شخص تھے۔ اور اردو اخبار نویسی کے موجد تھے۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں اردو زبان کا پہلا اخبار مولوی محمد باقر نے دلی سے نکالا تھا۔ آزاد نے عربی۔ فارسی کی تعلیم کالج کے اورنیٹل ڈپارٹمنٹ میں پائی۔ کالج کے امتحانوں میں مضمون نگاری میں سب طلباء میں اول رہتے۔ اردو نظم و نثر کے لکھنے کی استعداد انکو کالج ہی میں حاصل ہو گئی تھی۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد رشید تھے۔ جب غدر کے بعد مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کے قتل کے الزام میں مولوی محمد باقر مارے گئے۔ تو آزاد وطن چھوڑ کر

حیدر آباد دکن چلے آئے۔ ایک عرصہ تک یہیں رہے پھر لاہور گئے۔ مولوی رجب علی سابق میر منشی نے پنڈت من پھول میر منشی سے سفارش کر کے میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں پندرہ روپیہ مشاہرہ کی جگہ دلوائی میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مقرر ہوئے۔ انھوں نے سرکاری اخبار کا (۱۵ مع) ماہوار پر اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر کیا۔ اس کے اڈیٹر رائے پیارے لال آشوب تھے۔ جو آزاد کے بڑے خیر اندیش اور قدردان تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پنڈت من پھول کے ساتھ کابل اور بدخشاں گئے۔ وہاں سے لوٹ کر لاہور کے سرکاری کالج میں (۱۵۰) ماہوار پر عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں آپ نے ایران کا سفر کیا۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی پر آپ کو سرکار انگریزی کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ آزاد خاندان مغل سے تھے، اور آپ کی والدہ ایرانی النسل تھیں۔ اس لئے ان کے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ آپ فارسی عربی کے عالم متبحر تھے۔ اور اُن تمام علوم پر عبور رکھتے تھے جو ان زبانوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بھاشا اور ہندی کے نکات سے پورے آگاہ تھے۔ انگریزی علم ادب کی خصوصیات سے واقف تھے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ کو جنون کے آثار پیدا ہوئے۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ر محرم ۱۳۲۸ھ میں آپ نے انتقال فرمایا اور لاہور میں دفن کئے گئے۔

نثر میں آزاد کی کتابیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو انھوں نے پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے لئے لکھیں۔ یعنے اُردو کا قاعدہ اُردو کی پہلی۔ دوسری۔ تیسری۔ چوتھی۔ قصص ہند۔ قواعد اردو۔ فارسی کی پہلی۔ دوسری۔ جامع القواعد۔ ان میں قصص ہند اور جامع القواعد مشہور کتابیں ہیں۔ دوسری وہ جو انھوں نے اپنے شوق سے لکھیں۔ ان میں آب حیات۔ نیرنگ خیال دربار اکبری۔ سخندان فارس۔ قند پارسی۔ نصیحت کا کرن پھول وغیرہ ہیں۔ نیرنگ خیال میں انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویسی کے جدید طرز کا تجربہ اُتارا ہے۔ آب حیات شاعروں کا تذکرہ ہے۔

آزاد کی زبان شناء صفت سے مستغنی ہے۔ بیان کی فصاحت۔ زبان کی سلاست بندش کی چُستی۔ محاوروں کی دل آویزی۔ خیالات کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شوکت۔ اُسلوب کی دل فریبی جس قدر آزاد کے یہاں ہے دوسرے نثر نگاروں میں نہیں پائی جاتی۔ اور ظرافت کی چاشنی، مزید برآں مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے اور جذبات اور محسوسات انسانی کا چربہ اُتارنے میں آپ کو وہ ید طولیٰ تھا۔ کہ شاید اب تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اردو زبان کی نظم کی ترقی کے لئے آپ نے کہنہ طرز سخن کو بدل کر فن شاعری کو سہل کیا۔ اور ایشیائی تعشقانہ شاعری کی بجائے فطرتی مناظر کو اپنا عنوان بنالیا۔ اس طرز کے رواج دینے کو پہلے بطور نمونہ چند چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں جو مجموعۂ نظم آزاد میں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً شب قدر۔ موسم زمستان صُبح امید۔ حُب وطن وغیرہ۔ یہ طرز ایسی مقبول عام ہوئی کہ قدیم ڈگر پر چلنے والے شاعروں نے بھی یہی جدید طرز اختیار کرلی۔ اور مولانا حالی نے اس کے معیار کو بہت بلند کر دیا۔ جس قلم سے آزاد اعلیٰ سے اعلیٰ زبان میں لکھ سکتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے بچوں کی زبان میں بھی لکھا جس قلم نے آب حیات اور نیرنگ خیال لکھ کر اُردو کے فضلا کو حیرت میں ڈالا۔ وہی قلم

”

اردو کی پہلی اور میٹھی بولی لکھکر چھوٹے بچوں کو ہنسایا اور بہلایا۔ یہ وصف ایسا ہے جو دنیا کے بہت کم مُصنّفوں کے حصّہ میں آیا ہے۔

مدسودن پرشاد سکسینہ

طالب علم سکستھ فارم

دہلی کا جنتر منتر

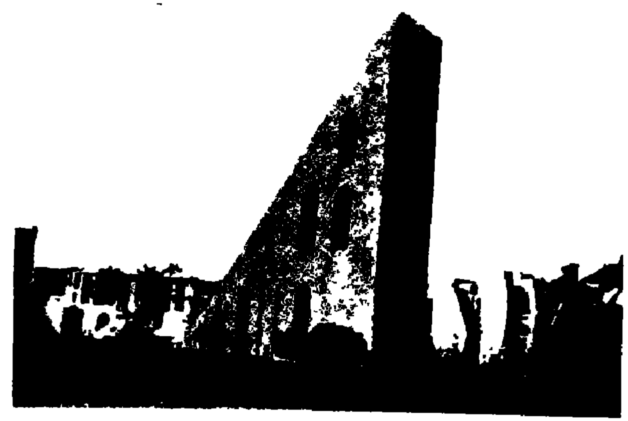
از

جناب جی۔ یس، بھان صاحب بی اے علیگ مددگار درسگاہ ہٰذا

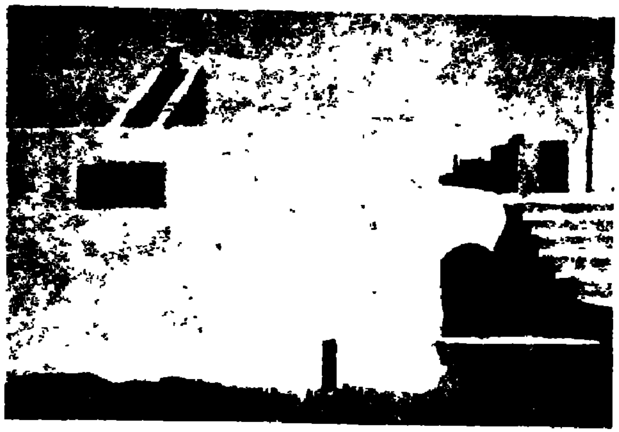
مہاراجہ سوائے جے سنگھ دوم ۱۶۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر میں ریاست امبر کا تخت سنبھالا۔ انھوں نے اپنی راج دھانی کا نام اپنے ہی نام نامی سے جے نگر رکھا جو بعد میں بدل بدلا کر جے پور ہو گیا انکی قابلیت اور سیاست دانی کا لحاظ کرتے ہوئے محمد شاہ نے انکو ۱۷۱۹ء میں آگرے کا صوبہ دار بنا دیا۔ ۱۷۳۲ء میں انکا تبادلہ مالوے کی صوبہ داری پر کیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد شہنشاہ کے حکم کی بنا پر مالوے کا صوبہ پیشوائے وقت کے حوالے کر کے اپنی سلطنت کو گئے اور ۱۷۴۳ء میں انتقال کیا۔

بچپن ہی سے انھیں علم ہیئت یعنے ستاروں کے علم سے دلچسپی تھی اور بہت جلد اس علم کو حاصل کیا۔ یوں تو مہاراجہ جے سنگھ نے علم ہیئت کی اُن تمام کتابوں کو پڑھا تھا جو سنسکرت زبان میں تھیں۔ لیکن اپنی معلومات کو اور وسیع کرنے کے لئے اس فن کی مختلف کتابوں کا عربی، لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ سب سے پہلے بٹالومی کی کتاب الُمجسٹ کے عربی ترجمۂ مجسطی سے سنسکرت میں ترجمہ کرایا۔ اس کتاب کا ترجمہ جگنا تھ نے کیا تھا۔ جو راجہ جے سنگھ کا خاص ماہر فن تھا۔ اسکے علاوہ یورپ کے دوسرے ماہرین فن کی کتابوں کا ترجمہ کرایا جن میں لا ہائیر، جان فلام اسٹیڈ اور اقلیدس بہت اہم ہیں۔ انکے علاوہ نصیر الدین طوسی، جمشید کاشی۔ اور الصوفی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ ان کے دربار میں ہندوستان کے پنڈت اور نجومی بلکہ ایران، عرب، فرانس، اٹلی، برطانیہ جیسے دور دراز ملکوں کے ماہر فن جمع رہتے تھے۔ آپس میں اکثر بحث مباحثے ہوتے تھے۔ جب معلومات کا خزانہ بھرپور ہو گیا تو مہاراجہ نے ایک رصدگاہ بنانے کا خیال کیا۔ اپنے دربا

الموسی



سمراٹ ینتر



پاتال ینتر





کے چند قابل لوگوں کو مختلف ملکوں کی رصدگاہوں کو ستاروں کا مشاہدہ کرنے کیلئے بھیجا۔ پادری مانیول کو پورٹ پادری فی گیوریڈز کو پرتگال، محمد شریف کو جنوبی نصف کرّے میں اور محمد مہدی کو دور دراز کے جزیروں کو رصدگاہوں سے ستاروں کے مشاہدے کے لئے بھیجا۔ ان لوگوں نے چاند گرہن، سورج گرہن کے اوقات اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کے محل وقوع کا مختلف رصدگاہوں سے مشاہدہ کیا۔ مشاہدے اور حساب میں بڑا اختلاف نکلا۔ ان لوگوں نے واپس ہوکر اسکی اطلاع مہاراجہ جے سنگھ کو دی۔ مہاراجہ نے پہلے پہل اور رصدگاہوں کی طرح اپنی رصدگاہ کے لئے پیتل کے اوزار بنائے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ایسے آلات سے جو بہت چھوٹے ہوتے ہیں صحیح حساب نہیں معلوم ہوسکتا۔ راجہ جے سنگھ نے ان غلطیوں کو رفع کرنے کے لئے سب سے پہلے دہلی میں پتھر اور چونے کے بڑے بڑے آلات بنائے اور کئی سال ان کے ذریعہ مشاہدہ کیا۔ جب اس طرح ان آلات کی صحت کا یقین ہوا تو جے پور، متھرا، بنارس اور اُجین میں بھی ایسے ہی آلات بنائے۔ ان آلات کی تعمیر کی اجازت شہنشاہ محمد شاہ سے حاصل کی گئی۔ جب ستاروں اور سیاروں کی ایک فہرست تیار ہوئی تو اسکو کتاب کی شکل میں لایا گیا اور اسکا نام شہنشاہ محمد شاہ کے نام نامی سے "زیجِ محمد شاہ" رکھا گیا۔

ان آلات کا نام جنتر منتر پڑ گیا۔ دہلی کا جنتر منتر پرانی دہلی کی جامع مسجد سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن نئی دہلی سے تو بالکل ہی ملا ہوا ہے۔ اس جنتر منتر میں حسب ذیل عمارتیں ہیں:-

(۱) سمراٹ ینتر (۲) پاتال ینتر (۳) رام ینتر (۴) سرا ینتر (۵) سمتھ ینتر۔

(۱) سمراٹ ینتر۔ یہ سب سے بڑی اور شاندار عمارت ہے جو جنتر منتر کی اور عمارتوں کے بیچوں بیچ ہے عمارت ایک بڑے مستطیل حوض میں بنائی گئی ہے جسکی لمبائی شمال سے جنوب تک ۱۲۰ فٹ اور مشرق سے مغرب تک ۱۲۵ فٹ ہے۔ اس حوض کی گہرائی زمین کی سطح سے ۱۵ فٹ ہے۔ اسکے بیچوں بیچ ایک مثلث قائم الزاویہ بنا ہوا ہے جسکے وتر کا رخ شمالاً جنوباً محور کے متوازی ہے۔ وتر کے بیچوں بیچ نیچے اوپر تک سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں کی دونوں جانب منڈیروں پر یعنی وتر کے دونوں بازوؤں پر درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس وتر کا رخ سماوی قطب شمالی (سے لس ٹی ال نارتھ پول) کی طرف ہے۔ یعنے دوسرے الفاظ میں دونوں سرے اُفق پر ۲۸-۲۷ کے زاویے بناتے ہیں جو دہلی کے عرض بلد کے مساوی ہیں۔ اس قائم الزاویہ کے خط مستقیم کے نچلے سرے کے ہر دو جانب مشرق اور مغرب میں ایک ایک دائرہ ہے جو خط استواء کے متوازی ہے۔ ان کا نصف قطر ۴۹.۵ فٹ ہے۔ ان کے ہر ایک کنارے کی درجہ بندی گھنٹوں اور منٹوں کے پیمانے سے کی گئی ہے۔ شمالی سرے کی درجہ بندی انگریزی ہندسوں میں اور جنوبی سرے کی درجہ بندی ہندی ہندسوں میں کی گئی ہے انکی مدد سے وقت معلوم کیا جاسکتا ہے۔ وتر کے بازوؤں کی منڈیروں کی درجہ بندی مماس کے پیمانوں سے کی گئی ہے۔ سورج کے طلوع

غروب کے دوران میں وتر کا سایہ ربع دائروں کے سروں پر پڑتا ہے تو اس سائے سے ہم ایک تو دہلی کا مقامی وقت اور دوسرے سورج کا سماوی خط استواء (اسے لس ٹی اَل ای کوئنٹر) سے شمال اور جنوب کی طرف فاصلہ معلوم کر سکتے ہیں۔

وقت معلوم کرنیکا طریقہ۔

صبح میں جب سورج نکلتا ہے تو وتر کا سایہ مغرب کی طرف کے ربع دائرے کے سرے پر پڑتا ہے اور جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے اسی طرح یہ سایہ بھی مغربی ربع دائرے کے سرے سے مشرق کی طرف ہٹتا ہے اور ٹھیک بارہ بجے جب سورج سر پر ہوتا ہے تو یہ سایہ بالکل نظر نہیں آتا ہے۔ بارہ بجے کے بعد سورج مغرب کی طرف جاتا ہے تو اس کا سایہ مشرقی ربع دائرے کے مغربی سرے پر نظر آتا ہے اور جیسے جیسے سورج مغرب کی طرف جاتا ہے تو یہ سایہ بھی مشرقی دائرے کے مغرب سے مشرق کی طرف ہٹتا ہے حتیٰ کہ غروب کے وقت سارا مشرقی دائرہ سایہ میں آجاتا ہے اس سائے سے پیمانے کے ذریعہ جو گھنٹوں اور منٹوں کے لحاظ سے ان ربع دائروں پر درج ہے دہلی کا مقامی وقت معلوم کیا جاتا ہے۔

یہ پہلے ہی بتایا گیا ہے کہ وتر کے دونوں بازو کی منڈیروں پر ماس کا پیمانہ مختلف زاویوں کے لئے درج ہے یہ پیمانہ وتر کے نچلے سرے سے اوپر تک اور اوپر سے نچلے سرے تک درج ہے۔ جو پیمانہ نیچے سے اوپر کی طرف لکھا ہوا ہے اس سے سورج کا فاصلہ سماوی خط استواء سے شمال کی طرف اور جو اوپر سے نیچے کی طرف لکھا ہوا ہے اس سے جنوب کی طرف فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ سورج کے اس فاصلے کو معلوم کرنیکا طریقہ یہ ہے کہ لوہے کی ایک سلاخ لیں۔ اگر پیمائش بارہ بجے سے پہلے کی جارہی ہو تو اس سلاخ کو وتر کے مغربی کنارے کی طرف اور اگر پیمائش بارہ بجے کے بعد کیجارہی ہو تو سلاخ کو وتر کے مشرقی کنارے کی طرف سیدھا کھڑا رکھیں۔ اس سلاخ کو وتر کے پیمانے پر اوپر نیچے اس طرح ہٹائیں کہ اس کا سایہ بارہ بجے سے پہلے مغربی ربع دائرے کے کنارے پر اور بارہ بجے کے بعد مشرقی ربع دائرے کے کنارے پر پڑے۔ اب وتر کے پیمانے کے جس درجے پر یہ سلاخ ٹھہرے اسکو پڑھیں تو اس سے سورج کا سماوی خط استواء سے اسوقت جو فاصلہ ہے معلوم ہوگا۔ اگر سورج سماوی خط استواء سے شمال کی طرف ہو تو سلاخ کا سایہ ربع دائرے کے بالائی سرے پر اور اگر جنوب کی طرف ہو تو نچلے سرے پر پڑیگا۔ اس طرح سمراٹ ینتر کی مدد سے دوسرے ستاروں اور سیاروں کا سماوی خط استواء سے فاصلہ اور وقت معلوم کیا جاسکتا ہے اسکو معلوم کرنیکا طریقہ یہ ہے کہ ایک مضبوط ڈوری لیں۔ ایک صاحب ڈوری کا ایک سرا لیکر وتر پر کی سیڑھیوں پر کھڑے رہیں اور دوسرے صاحب ڈوری کا دوسرا سرا لیکر ربع دائرے کے پاس۔ اس ڈوری کو ربع دائرے اور وتر کی درجہ بندی پر اس طرح ہٹائیں کہ وہ ڈوری اور ستارہ یا سیارہ جس کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہے۔ ایک ہی خط میں آجائیں۔ اس وقت ربع دائرے کی درجہ بندی سے وقت اور وتر کی درجہ بندی سے اس ستارے یا سیارے کا

الموسی



اسمتھ ینڈر



کشافان ستی کالج

مساوی خط استوا سے فاصلہ معلوم ہوگا۔

وتر کے بالائی حصّے پر ایک چھوٹا سا سات یا آٹھ فٹ لمبا گول کھم ہے جو غالباً سمت الراس کے معلوم کرنے کے لئے بنایا گیا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں اس کھم پر یورپی وضع کی دھوپ گھڑی بنا دی گئی۔

مہاراجہ جے سنگھ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمراٹ ینتر کی عمارت پتھر اور چونے سے بنائی گئی۔ ہنٹر اور تھارن کا کہنا ہے کہ وتر کے سرے سنگ مرمر کے تھے اور ڈان آر لیبج لکھتا ہے کہ وتر کی سیڑھیاں سنگ مرمر کی تھیں لیکن اب تو نصف دائروں پر چونے کی استرکاری کی ہوئی ہے اور نصف دائروں کے سروں پر کالے پتھر جڑے ہوئے ہیں جن پر وقت کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ وتر کے بازوؤں پر چونے کی استرکاری ہے اور اس پر حماس کے پیمانے درج ہیں۔

(۲) پاتال ینتر۔ سمراٹ ینتر کے پاس ہی جنوب کی طرف پاتال ینتر کی عمارت ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اس کمرے کی جنوبی دیوار پر سطح زمین کے برابر سیدھے جانب ایک چھوٹا سا لمبا سوراخ ہے جو تصویر میں کالا نظر آتا ہے۔ ۲۱ مارچ کے روز ساری دنیا میں دن اور رات برابر ہوتے ہیں، ہم کو اعتدال ربیعی کہتے ہیں۔ تو اس دن آفتاب کی شعاعیں اس سوراخ میں سے ہو کر کمرے میں پڑتی ہیں۔ ایسے ہی چھ مہینے کے بعد ۲۳ ستمبر کے روز دن اور رات مساوی ہوتے ہیں اس دن بھی آفتاب کی شعاعیں اس سوراخ میں سے ہو کر کمرے میں پہنچتی ہیں ان دونوں کے سوا سال بھر میں کسی اور دن آفتاب کی شعاعیں کمرے میں نہیں پہنچتیں۔

(۳) رام ینتر۔ بعض پنڈتوں کا کہنا ہے کہ اس عمارت کو مہاراجہ جے سنگھ نے اپنے ایک بزرگ کے نام سے رام ینتر موسوم کیا۔ لیکن ہنٹر کا خیال ہے کہ اسطوانی بھی کہتے تھے یہ نام البیرونی کے اس آلے سے لیا گیا جو اس نے ظل اسطوانی کی مدد سے زمین کا نقشہ بنانے کے لئے تیار کیا تھا اور جس کی شکل رام ینتر کے جیسی تھی۔ رام ینتر کی دونوں عمارتیں اسطوانی وضع کی ہیں ان کی چھت کھلی ہوئی اور ان کے بیچ میں ایک کھم ہے یا یوں کہا جائے کہ ان عمارتوں میں ایک ایک لمبا کھم ہے جس کی بلندی سطح زمین سے ۲۷ فٹ ½ ۶ انچ ہے لیکن اس کھم کی درجہ بندی نچلے حصّے سے تین فٹ چھوڑ کر اوپری سرے تک کی گئی ہے۔ یعنی ان کھموں کی لمبائی جہاں سے کہ درجہ بندی کی گئی ہے صرف ۲۴ فٹ ½ ۶ انچ ہے۔ ان کھموں پر تین فٹ کی بلندی سے اطراف میں گول دیوار کی طرف قطاع بنائے گئے ہیں جو زمین سے تین فٹ اوپر ہیں۔ ان قطاع کو سہارنے کیلئے نیچے کی طرف کھم بنائے گئے ہیں۔ اصل میں ۶۰ قطاع ہیں اور ہر ایک کا زاویہ چھ درجے ہے۔ مشاہدے کی سہولت کے خیال سے ہر ایک عمارت میں صرف تیس تیس قطاع بنائے گئے ہیں۔ ہر قطاع کے بعد جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے اور ان کے جوابی حصّے (کراس پائنڈنگ سکشن) دیوار پر کھلے رکھے گئے ہیں جو قطاع ایک عمارت میں بنائے گئے ہیں انکی جگہ دوسری عمارت میں خالی چھوڑ دی گئی ہے اور ان قطاع کو

بتا رکھا ہے جو [illegible] عمارات [illegible] بنائی گئی تھیں [illegible] حالانکہ دونوں [illegible] تینوں حصے ایک ہی ہیں۔ تصویر میں دیکھنے [illegible] دیوار [illegible] جیسے [illegible] نکلے ہوئے قطاع کے جوابی حصے ہیں اس سے ارتفاع [illegible] سمت الراس معلوم کر سکتے ہیں اور اسی کے [illegible] قطاع اور [illegible] کی دیوار پر جوابی حصے (کرس پانڈنگ سکشن) کی [illegible] دیوار اور کھمبہ کی مجموعی مسافت [illegible] کی لمبائی کے برابر ہے۔ دیوار پر درجہ بندی بالائی سرے سے کی گئی ہے۔ بالائی سرے سے [illegible] یہاں سے دیوار کے نیچے تک ۴۵ درجے بنے ہوئے ہیں۔ پینتالیسویں درجے کا نشان دیوار کے نچلے سرے پر ہے دیوار کے نچلے سرے سے بیچ کے کھمبے تک ۴۵ درجے سے ۹۰ درجے تک درج ہیں۔ نوے درجے کا نشان کھمبے کے ٹھیک نچلے سرے پر ہے۔ اسکی مدد سے سورج کا ارتفاع معلوم کیا جاتا ہے۔ سمت الراس معلوم کرنے کے لئے [illegible] دونوں عمارتوں کی سطح (فلور) کو [illegible] ۲۰ برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ۱۰ حصے ایک عمارت میں [illegible] ۱۰ حصے دوسری عمارت میں ہیں ان دونوں عمارتوں کی مدد سے سورج کے سمت الراس اور ارتفاع کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سورج کا ارتفاع اور سمت الراس معلوم کرنے کا طریقہ۔

سورج کا ارتفاع اور سمت الراس معلوم کرنے کے لئے بیچ کے کھمبے کا سایہ مشاہدہ کرنا چاہئے۔ جب سورج نکلتا ہے تو کھمبے کا سایہ ٹھیک دیوار کے اوپری سرے پر پڑتا ہے جس سے [illegible] سورج کا ارتفاع صفر ہے۔ جیسے جیسے سورج آگے بڑھتا ہے تو کھمبے کا سایہ دیوار پر نیچے کی طرف ہٹتا ہے [illegible] سے ۴۵ [illegible] تک بڑھ جاتا ہے تو کھمبے کا سایہ ٹھیک اسی مقام پر پڑتا ہے جہاں دیوار اور قطاع ملتے [illegible] اسکے بعد جوں جوں آفتاب اور بلند ہوتا ہے تو کھمبے کا سایہ کھمبے ہی کی طرف ہٹتا جاتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ [illegible] یہاں تک کہ جب سورج سر پر آ جاتا ہے تو کھمبے کا سایہ نظر ہی نہیں آتا جسکے یہ معنے ہوئے کہ سورج کا ارتفاع ۹۰ درجے ہے اور وہ خط جو کھمبے کے سائے کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے سورج کے سمت الراس کو ظاہر کرتا ہے۔ اسکی مدد سے دوسرے سیاروں اور ستاروں کا بھی ارتفاع اور سمت الراس معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کو [illegible] کا طریقہ یہ ہے ایک ڈوری لیں اس کا ایک سرا کھمبے کے بالائی سرے پر رکھیں اور دوسرا سرا دیوار اور قطاع کی درجہ بندی پر اس طرح ہٹایا جائے کہ یہ ڈوری اس ستارے یا سیارے سے ایک خط میں آ جائے جس کا ارتفاع اور سمت الراس معلوم کرنا ہے۔

(۴) مسرا ینتر۔ سمراٹ ینتر کے شمال مغرب میں تقریباً (۱۴۰) فٹ کے فاصلے پر مسرا ینتر کی عمارت ہے یہ عمارت چار آلات پر مشتمل ہے جو ذیل میں درج ہیں:-

(۱) نیات چکرا ینتر۔ (۲) سمراٹ ینتر (۳) دکشینو ورتی ینتر۔ (۴) کرک راشی ولایا

(۱) نیات چکرا ینتر۔ مسرا ینتر کی عمارت کے بیچ میں نیات چکرا ینتر ہے اسمیں ایک وتر ہے اس کے مشرق

اور مغرب میں دو دو نصف دائرے ہیں۔ مشرقی نصف دائروں کے مشرق میں ایک وتر اور اس سے ملا ہوا مشرق میں ایک ربع دائرہ ہے اسی طرح مغربی نصف دائروں کے مغرب میں ایک وتر اور اس سے ملا ہوا مغرب میں ایک ربع دائرہ ہے۔ نصف دائروں کے مرکز وتر پر ہیں۔ جہاں سوراخ بنے ہوئے ہیں ان میں پنسل یا لکڑی کھڑے کر سکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سورج کا ارتفاع صبح میں چھ بجکر ۲۵ اور ۷ بجکر ۴۲ منٹ کو اور شام میں ۴ بجکر ۳۶ منٹ اور ۵ بجکر ۸ منٹ کو معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ چار مشہور رصدگاہوں کا نصف النہار بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے دو دہلی کے مشرق اور دو دہلی کے مغرب میں ہیں۔ اسکے معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ ایک لکڑی وتر کے مرکزی سوراخ میں ۶ بجکر ۲۵ منٹ صبح کھڑی کریں تو اس کا سایہ مغرب کی طرف بیرونی نصف دائرے پر اور صبح میں ۷ بجکر ۴۲ منٹ پر اسی جانب اندرونی نصف دائرے پر پڑیگا۔ ان نصف دائروں کی درجہ بندی سے سورج کا ارتفاع معلوم ہوسکتا ہے اسی طرح شام کو ۴ بجکر ۳۶ منٹ پر لکڑی کا سایہ مشرق کی طرف اندرونی نصف دائرے پر اور ۵ بجکر ۸ منٹ پر اسی جانب بیرونی نصف دائرے پر پڑیگا۔ سوائے اوپر بیان کئے ہوئے اوقات کے لکڑی کا سایہ نصف دائروں پر کسی اور وقت نہیں پڑتا صبح میں ۶ بجکر ۲۵ منٹ پر لکڑی کا سایہ مغرب کی جانب بیرونی نصف کرنے پر پڑتا ہے۔ اسوقت "ناٹ کے" میں جہاں جاپان کی ایک اہم رصدگاہ ہے نصف النہار ہوگا صبح میں ۷ بجکر ۴۲ منٹ پر لکڑی کا سایہ اسی جانب اندرونی نصف دائرے پر پڑتا ہے اسوقت "سری چیو" میں جو سائبیریا کے مشرق میں جزائر پک (پک آئی لینڈ) پر واقع ہے۔ نصف النہار واقع ہوگا ویسے ہی شام کے وقت ۴ بجکر ۳۶ منٹ پر لکڑی کا سایہ مشرق کی طرف اندرونی دائرے پر اور ۵ بجکر ۸ منٹ پر اسی جانب بیرونی دائرے پر پڑیگا۔ زیورچ واقع اٹلی اور گرینچ واقع انگلینڈ میں ۴ بجکر ۳۶ منٹ پر علی الترتیب نصف النہار ہوگا۔

(۲) سمراٹ ینتر۔ نیات چکرا ینتر کے مغرب اور مشرق میں ایک ایک وتر اور ان کے ساتھ ایک ایک ربع دائرہ ہے یہ عمارت سمراٹ ینتر کے مانند ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بجائے ایک کے اسکو دو حصوں میں بنایا گیا ہے ان میں سے ایک نیات چکرا ینتر کے مغرب میں اور دوسرا مشرق میں ہے۔ مغربی حصے کے ذریعہ صبح سے بارہ بجے دن تک اور مشرقی حصہ کے ذریعہ دن کے ۱۲ بجے سے شام تک وقت اور سورج کا ارتفاع معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مشاہدے کا طریقہ وہی ہے جو سمراٹ ینتر کے بیان میں لکھا گیا ہے۔

(۳) دکشنی نوورتی ینتر۔ مسر ینتر کی عمارت کی مشرقی دیوار کے مشرقی رخ پر شمال سے جنوب تک ایک نصف دائرہ ہے جسکی درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔ اس نصف دائرے کے مرکز میں ایک لکڑی لگادی گئی ہے۔ اس آلے کے ذریعہ کسی سیارے یا ستارے کا ارتفاع معلوم کر سکتے ہیں۔ مشاہدے کا یہ طریقہ ہے ایک ڈوری لیکر

اسکو نصف دائرے کے مرکز میں جو لکڑی نصب ہے اس سے باندھ دیں خود اس لکڑی کے پاس سے مشاہدہ
کریں اپنے ساتھی کو دوسرا سرا دیں تاکہ وہ اس سرے کو درجہ بند نصف دائرے پر اس طرح پھرائیں کہ وہ سیارہ یا ستارہ
جس کا ارتفاع معلوم کرنا ہے اس لکڑی سے ایک ہی سیدھ میں آجائے اس وقت درجہ بند نصف دائرے پر جہاں
ڈوری ٹھیرے اس کو پڑھ لیا جائے تو وہی اس ستارے یا سیارے کا ارتفاع ظاہر کریگا۔

(۴) کرک راسی والا یا۔ مندر کی پشت کی دیوار پر یعنی شمالی دیوار کے شمالی رخ پر ایک نصف دائرہ بنا ہوا ہے
جسکے مرکز میں ایک لکڑی نصب ہے اس نصف دائرے پر مشرقی اور مغربی سروں سے درجہ بندی کی گئی ہے
یعنی ان کے سروں پر صفر درج ہے اور نصف دائرے کے بیچ میں ۹۰ درجے لکھا ہوا ہے جو دونوں کے لئے ایک
ہی ہے جب سورج دائرہ سرطان میں داخل ہوتا ہے تو اسکی روشنی شمالی دیوار پر پڑتی ہے اسوقت لکڑی کا سایہ
درجہ بند نصف دائرے پر پڑتا ہے جس سے سورج کا ارتفاع معلوم ہوتا ہے۔

استھم بنتر۔ مندر کے جنوب مغرب میں دو کھم ہیں۔ ان میں ایک بڑا ہے اور ایک چھوٹا۔ ان کا درمیانی فاصلہ
۷ فٹ ہے ان کا ذکر کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا انکی مدد سے برس کا سب سے بڑا دن اور سب سے چھوٹا دن معلوم
کیا جاتا ہے۔ ۲۱ جون کا دن شمالی نصف کرہ کا سب سے بڑا دن ہے اس روز جب آفتاب سر پر آتا ہے تو بڑے
کھم کا سایہ بالکل دکھائی نہیں دیتا اور یہی شمالی نصف کرہ کا سب سے بڑا دن ہے۔ سال بھر میں یہی ایک دن ہوتا ہے
جبکہ بڑے کھم کا سایہ نظر نہیں آتا۔ ۲۱ دسمبر کا دن شمالی نصف کرہ کا سب سے چھوٹا دن ہے اس روز شام
کے پانچ بجے جب آفتاب مغرب کی طرف رہتا ہے تو چھوٹا کھم اوپر سے نیچے تک بڑے کھم کے سائے میں
آجاتا ہے اور یہی سب سے چھوٹا دن ہے۔ سال بھر میں اسی دن چھوٹا کھم کے سائے میں آجاتا ہے۔

اُردو نثر میں ایک جدید اسلوب

مہدی حسن مرحوم نے اُردو نثر میں اپنے اسلوبی اختراعات اور اپنے بے مثل طرزِ انشا سے چند ایسے نقوش چھوڑے جو آج تک اُردو ادبِ نثر کے لیے تخیل بنے ہوئے ہیں اور اُن کے اسالیب کی تہذیب و تبیین میں حصہ لے رہے ہیں۔ "خوابِ طفلی" اور "آرزوئے شباب" کے مصنف گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ لیکن اوائلِ شباب سے لے کر آخری ایام تک اُن کی زندگی کا بہت کم حصہ گورکھپور میں گزرا۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اُن کو اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ پردیس کی نذر کر دینا پڑا، اور وہ بھی ایسی فضا میں جس کو ایک انشا پرداز کے لیے کسی طرح حوصلہ افزا یا نشاط انگیز نہیں کہہ سکتے۔

انھوں نے جن دم گھٹا دینے والی زحمتوں اور بندشوں میں اپنی زندگی بسر کی اُن کو نظر میں رکھیے تو ماننا پڑتا ہے کہ اگر فطرتاً ان کی طبیعت میں ایک جمالیاتی کیفیت اور ایک ابداعی اپج نہ ہوتی تو اُن سے یہ منتفرقات بھی یادگار نہ رہتے جو اس وقت رہ گئے ہیں۔ پھر جس شخص کو فطرت نے صناع پیدا کیا ہو وہ ہمارے لیے جو کچھ بھی کر جائے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ نقاد کا کام معدوم سے نہیں بلکہ وجود سے بحث کرنا ہوتا ہے۔ ایک صناع جو کچھ کر گیا ہم کو اسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھنا چاہیے! افادی الاقتصادی اپنی زندگی کے جتنے لمحے ادب و انشا کو دے سکتے تھے دے گئے

اس سے انکار نہیں کہ افادی الاقتصادی نے جتنے مقالات لکھے ہیں اور جو "افاداتِ مہدی" کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت میں شایع ہو چکے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہیں جن کو وقتی یا موسمی کہنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کا قلم واقعی ایک صناع کا قلم تھا جو بے جان سے بے جان چیز میں زندگی پیدا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "تمدنِ عرب پر ایک کھلی چٹھی" علامہ شبلی کا ماہوار رسالہ "شبلی سوسائٹی" نامی پریس کانپور کی لٹریری خدمات" "نقاد پر ایک غیر ستائشی جنبشِ لب" اور اسی قسم کے اور عصری مضامین کو "افاداتِ مہدی" میں آج بھی پڑھیے تو وہی لذت ملتی ہے، جو آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے ملتی۔ حالانکہ ان عنوانات میں بجائے خود زندہ رہنے کی صلاحیت نہ تھی۔

اُردو نثر کی تاریخ میں میر امن کے بعد شبلی تک مجھے سوا آزاد کے کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جس کے صرف اسلوب میں اتنی زندگی ہو جتنی افادی الاقتصادی کے اسلوب میں ہے، اور محض اپنے اسلوب کی بنا پر تاریخ ادب میں

ایسی مستقل حیثیت کا مالک اور ایسی پائدار زندگی کا مستحق ہو۔ شبلی کے اسلوب کو موضوع کی اہمیت اور وقعت سے الگ کر لیجیے تو اس میں کچھ زیادہ رہ نہیں جاتا۔ ان کا اسلوب اپنے تمام تناسب اور آہنگ کے باوجود فاضلانہ طرز تحریر سے آگے نہیں بڑھتا۔ حالی کا انداز تحریر بھی بے تکلف، پختہ اور سادہ ہے مگر اس کے اندر کوئی خاص جمالیاتی کیفیت نہیں۔ مہدی کے اسلوب میں ایک البیلا پن ہوتا ہے جو صرف کسی افسانہ نگار کو زیب دے سکتا ہے۔ افادی الاقتصادی کے اسلوب کی اہمیت موضوع کی اہمیت سے بالکل الگ ایک چیز ہے اور بڑے مرتبے کی چیز ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت جمالیت ہے۔ ان کے اندر ایک خداداد ذوق جمال تھا جو ان کی تحریروں میں بھی اسی طرح نمایاں اور محسوس رہتا تھا جس طرح کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں۔ خود شبلی ان کے معترف ہیں اور یہ اعتراف محض زبانی یا رسمی نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے۔ دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کرنے کی بات نہیں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا نیچے تمھارے نام کی دستخط تھی حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔" شبلی کی نظر نذیر احمد اور آزاد کے دائرے سے باہر نہ جا سکی۔ ان کو یہ احساس نہ ہو سکا اور کیسے ہوتا، کہ دراصل والٹر پیٹر، رسکن اور آسکر وائلڈ کی روحوں نے ہندوستان میں آ کر ایک اردو انشا پرداز کا جنم لیا ہے۔ مجھے اردو نثر نگاروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو افادی الاقتصادی کا ہم زبان قرار دیا جائے اور جس کے اسلوب سے ان کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے۔

افسوس ہے کہ زمانے نے ان کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کوئی مستقل اور منضبط تصنیف چھوڑ جاتے جو موضوع کی اہمیت اور خیالات کی گرانمایگی کے اعتبار سے اسی قدر وقیع اور عظیم الشان ہوتی جس قدر کہ ان مغربی انشا پردازوں کی تصنیفیں ہیں۔ اس وقت زیادہ وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرحوم، پیٹر اور رسکن کے حریف تھے۔ لیکن جہاں تک ذوق و نظر اور انداز و اسلوب کا تعلق ہے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مہدی حسن مرحوم انھیں مشاہیر روزگار کی جماعت میں شمار کیے جانے کے لائق تھے۔ قبل اس کے کہ میں ان کے متعلق کچھ اور کہوں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبارت کے کچھ نمونے آپ لوگوں کے سامنے پیش کروں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہ جائے کہ میں صرف خلا میں باتیں کر رہا ہوں۔ "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" میں ایک جگہ ضمنی طور پر لکھتے ہیں:۔

"یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانے میں حیدرآباد دکن کے "بسمارک" کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا۔ سر سالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر پر ہیں۔ طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے، چھری کانٹوں کی

دھیمی موسیقیت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے۔" ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرے پر وہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہو رہی ہے جیسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہیئے۔ نذیر احمد کے خوان ادب کا یہ لقمہ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے، جیسے ہم اگلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بے نمکی روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ۔ ۔"

آپ نے دیکھا انشائے لطیف کسے کہتے ہیں۔ ایک لفظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیجیئے یا اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے۔ سارا آہنگ بگڑ کر رہ جائے گا۔ تشبیہ کس قدر دلنشیں اور برمحل ہے اور کس سلیقے کے ساتھ شروع سے آخیر تک نباہی گئی ہے۔ نثر میں تشبیہات و استعارات کو اس لطف کے ساتھ نباہنا نہایت دشوار کام ہے۔ اسلوب کی یہ لطافتیں ہم کو "افادات مہدی" کے ہر صفحے پر ملتی ہیں۔

"ترکوں کی معاشرت" کے سلسلے میں فرماتے ہیں:-

"یونانیوں کا تخیل صرف تکمیل انسانیت تھا۔ یعنے وہ ہستیٔ موجود سے آگے نہیں جاتے تھے۔ ان کے خیال میں قوائے فطری کی نشو و نما اور ان کا معتدل استعمال۔ بس یہی غائت زندگی تھا۔ یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا۔ یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ہستی جو گہوارے سے شروع ہوتی ہے در حقیقت موجودہ بقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ یہ حرف غلط ہے۔ ترقی کا افتتاح آغوش لحد میں پہنچ کر ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم دنیا میں کہاں تک متمدن اقوام کے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی بھی اُردو [illegible] کی داد دیتے جس نے ایک [illegible] بازاری [illegible] کل [illegible] کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی ذہنی لوازمیوں اور لطف سخنوں میں دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے جو انہوں پر آئی ہوئی پنچی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعرائے [illegible] رہا [illegible] کھل کھیلی [illegible] کیونکہ اب زمانہ [illegible] سب کو ملتی رہی بعض جگہ بے آبروئی [illegible] ہو گئی اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے پچھلے ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی [illegible] میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ ۔ لیکن دفعتاً اس کی حالت نے پلٹا کھایا کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنا گیا ہے خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انھیں کے تصرف میں رہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اس قسم کے نوادراتِ ادب سے "افاداتِ مہدی" بھری پڑی ہے۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے تھا۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے افادی الاقتصادیؔ کا ہمسر اُردو نثر نگاروں میں مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ حالیؔ، آزاد، نذیر احمد، شبلی سبھی کے دل سے معتقد تھے، اور ان کے ساتھ غلو کو راہ دیتے تھے، اور خاص کر شبلی کو تو وہ خدائے ادب سمجھتے تھے، اور پوجتے تھے۔ بہت ممکن ہے انھوں نے اپنے خیال میں اُردو نثر کے ان عناصرِ اربعہ سے اپنی ادبی قوت کی تربیت میں مدد بھی لی ہو۔ لیکن جہاں تک میں خود مطالعہ کر سکا ہوں میں نے افادی الاقتصادیؔ کی تحریروں میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید کے کوئی آثار نہیں پائے ہیں۔ نذیر احمد اور آزاد سے ان کو تھوڑی بہت نسبت دی جا سکتی ہے لیکن پھر یہ نسبت اتنی ہی دُور کی ہو گی جتنی کہ بتوں کو کعبہ سے ہو سکتی ہے۔ نذیر احمد کا اسلوب اپنی تمام نسائی دل آویزیوں کے باوجود اس رومانی کیفیت سے بے گانہ ہے جو صرف مغرب کی چیز ہے، اور جو صاحبِ "افادات" کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آزاد کے اسلوب میں رنگینی اور بانکپن جس قدر بھی ہو وہ اس قابل نہیں کہ بلیغ اور گہرے اشارات کا حامل ہو سکے۔ یعنے ان کے اسلوب میں معنویت نہیں ہے۔ بر خلاف اس کے افادی الاقتصادی کا اسلوب محض تخیلی نہیں ہے۔ اس میں معنویت کے تمام امکانات موجود ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ بلیغ بھی ہے جس میں گہری سے گہری بات کہی جا سکتی ہے اور یہ یقیناً مغرب کی دین تھی۔ مہدی مرحوم نہ صرف مغربی طرزِ معاشرت کے قائل تھے بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی طرزِ فکر اور طرزِ بیان سے بھی متاثر تھے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغربی نثر نگاری کے اسالیب و صور کو حل اور جذب کر کے اُردو نثر کے فطری عناصر بنائے۔ اس کا شاید بہت کم لوگوں کو احساس ہو کہ اُردو نثر میں گذشتہ تیس سال سے جو مغربی طرز رائج و مقبول ہے اس کے موجد نہ حالیؔ نہ شبلی، بلکہ خوش اسلوب افادی الاقتصادی تھے تواریخ و سیر اور تحقیق و تنقید میں حالیؔ و شبلی کا مرتبہ مسلّم ہے اور اس اعتبار سے ان لوگوں کی برابری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے تاریخ و تنقید کو جدید اصولِ فن کی رو سے وضع بنایا لیکن اُردو کے جدید اسلوبی میلانات کو متاثر و متعین کرنے میں اُن کا وہ حصہ نہیں ہے جو افادی الاقتصادی کا ہے اُردو نثر کے موجودہ اسلوب کا سنگِ بنیاد یقیناً افادی الاقتصادی نے رکھا۔ اگرچہ ان کے بعد پھر کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو صحیح معنوں میں ان کا مقلد کہا جائے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ آزاد کی طرح ان کا اسلوب بھی بیک وقت باعثِ رشک اور ناقابلِ تقلید تھا۔

"افادی الاقتصادیؔ کی تحریروں کی امتیازی شان وہ نفاست اور نزاکت ہے جو ان کی فطرتِ ثانی تھی اور جو صرف مغرب میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اپنی قابلِ قدر تصنیف "اسالیبِ بیان" میں لکھتے ہیں، "مہدی، رسکن کی طرح الفاظ کے خوشنما بیل بوٹے بنا کر

پیش کرتے ہیں۔" آگے چل کر اسی مصنف کی رائے ہے کہ "ان کی عبارتیں انگریزی کہانیوں کی طرح خوشنما ہونے کے علاوہ سہل الفہم بھی ہوتی ہیں۔"

لیکن مجھے "افادی اقتصادی" والٹر پیٹر سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی عبارت میں جو نغمیری آہنگ اور اُن کے اسلوب میں جو لطیف ترنم ہوتا ہے وہ کافی حد تک رسکن کی یاد تازہ کرتا ہے لیکن پھر بھی مصنف کے اپنے تیور اور اس کا اپنا زاویۂ نگاہ بھی کوئی چیز ہے۔ رسکن کے اندر جو واعظانہ رنگ غالب رہتا تھا اس کی کوئی علامت مہدی مرحوم میں نہیں پائی جاتی۔ رسکن کے خیال میں جمالیاتی حُسن بجائے خود کوئی قدر و قیمت کی چیز نہیں۔ وہ جمالیات کو اخلاقیات کی روشنی میں دیکھتا ہے اور حُسن کو خیر کے ماتحت تصور کرنا چاہتا ہے جس سے حُسن کی اپنی قدر گھٹ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے پیٹر جو پری رفالائٹ صناعوں اور فرانسیسی مدرسۂ جمالیات سے متاثر ہو چکا تھا حُسن اور وہ بھی حُسن صورت کو حاصلِ کونین سمجھتا تھا جس کے ساتھ اس کے والہانہ جذبات عبودیت کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس کے خیال میں حُسن کے لئے کسی قسم کے خارجی اعتبارات کی ضرورت نہیں حُسن اگر حُسن ہے تو سب کچھ ہے۔ یہی انداز افادی کا ہے۔ "انگریزی کے جوانمیر شاعر کیٹس کی طرح ان کے لئے بھی حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے۔" وہ خالص حُسن اور خالص صناعی کے قائل ہیں اسی لئے ان کو اسلوب کا اتنا ہی تیز اور شدید احساس ہے، جتنا پیٹر کا تھا، یا جتنا اس کے بعد اس کے پیرو آسکر وائلڈ کو رہا۔

"افادی الاقتصادی" نے جتنے مقالات لکھے ہیں ان میں سے بیشتر تنقیدیں ہیں۔ اس کا اعتراف ہے کہ یہ تنقیدیں زیادہ تر وقتی اور سرسری ہیں۔ بہرحال تنقیدیں بہ حیثیت تنقید نگار کے بھی وہ بہت کچھ پیٹر ہی کی یاد دلاتے ہیں۔ پیٹر کا تنقیدی اسلوب محاکاتی یا ارتسامی ہوتا ہے جس کو ہیزلٹ اور لیمب کا ترکہ سمجھنا چاہیئے۔ افادی الاقتصادی کا انداز تنقید بھی یہی ہے۔ اُردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پیٹر کی طرح انھوں نے بھی تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبے کی چیز بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی وقتی باتوں میں اس قدر ہمیشگی پیدا کر سکے ہیں کہ آج بھی ہم اُن سے اسی طرح کیف اندوز ہوتے ہیں۔

جن انگریزی انشا پردازوں کا ذکر میں نے کیا ہے ان سب میں ایک عنصر مشترک یہ بھی تھا کہ ان کی تحریریں ان کے ذاتی میلانات اور ان کے اپنے مزاج و طبیعت کا آئینہ ہوتی تھیں۔ افادی الاقتصادی کی بھی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ان کی انفرادی زندگی کے آثار ہر لحہ بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ ان کے مزاج کی نفاست اور ان کی فطری شرافت ان کے ایک ایک لفظ میں جھلکتی ہوتی ہے۔

افادی الاقتصادی فن مکتوب نگاری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں۔ غالب کے بعد اُردو میں ایسا خط لکھنے والا نہیں پیدا ہوا۔ یوں تو اکثر مشاہیر ادب اُردو

البتہ ملیں گے جن کے مکتوبات کو ہم آنکھوں سے لگاتے ہیں۔
لیکن خطوطِ مہدی کی بات ہی کچھ اور ہے ان کو پڑھئے تو
معلوم ہوگا کہ دراصل خط لکھنے کا سلیقہ کیا ہے۔ اور
ہندوستانی ابھی اس سلیقے سے کس قدر بیگانہ ہیں۔ مجھے تو
"عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں بھی وہ بات نہیں ملی
جو خطوطِ مہدی میں ہے۔ غالب کے خطوط سے تکلف
[illegible] آتی ہے میں بعض جدید نقادوں
کی طرح یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ غالب واقعی
محنت و کاوش کے ساتھ خط لکھتے تھے اور یہ سمجھ کر
کہ ممکن ہے آئندہ ان کے خط شائع ہو جائیں لیکن
پڑھنے والوں کو اس قسم کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کے
خطوط کا مجموعی آہنگ وہی ہے جس کو خود غالب کی
زبان میں "سادگی یا پرکاری" یا افادی الاقتصادی کی
اصطلاح میں [illegible] "بے ساختہ پن" کہیں گے لیکن
خطوطِ مہدی کا طرۂ امتیاز وہ بے تکلفی اور معصومیت ہے
جو فطری ہوتے ہوئے بھی خالص صناعی کا حکم رکھتی ہے
وہ اردو مکتوب نگاری کے کاؤپر ہیں۔ ان کے
خطوط بھی اسی طرح خلوص اور صداقت سے معمور
اور ریا و تصنع سے خالی ہوتے ہیں جس طرح کہ کاؤپر کے
خطوط۔ وہ جانتے ہیں کہ روز کی معمولی باتوں میں
ندرت اور تازگی کیسے پیدا کی جائے اور اہم اور
غیر معمولی باتوں کو خلوص، سادگی اور تاثیر سے بھر کر
عوام کے لئے دلچسپ کیونکر بنایا جائے۔ کاؤپر کی طرح
وہ بھی خطوط میں اپنی ساری شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔
لیکن کہیں سے خودی یا انانیت یا کسی قسم کے عصبی تناؤ کا
احساس نہیں آنے دیتے انھوں نے روزمرہ کی زندگی کو
اپنے خطوط میں رومان بنا دیا ہے۔

اپنی بڑی لڑکی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ـــ

"تمہارے ہاتھ کی کھجوروں نے الہ آباد کی زندگی
یاد دلائی۔ کیسی اچھی شاندار زندگی تھی۔ تم نے نئے سر سے
زندگی پائی۔ خدا کرے اس درمیان میں تم نے پوری
تندرستی حاصل کی ہو۔ اور اس قابل رہو کہ تمہارے خیال سے
دل بہلاتا رہوں۔"

اسی لڑکی کو ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:ـ

"خدا پر بھروسہ رکھو اور ذرا بھی دل گیر نہ ہو۔ یہ
فطرت کے معمولی عوامل ہیں جو ہوتے رہتے ہیں۔ خدا
میری [illegible] بیٹی کو تلف نہ کرے گا ثبوت یہ ہے کہ
تم نے ایک غیر علاج پذیر مرض سے معجزانہ شفا پائی ہے
اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو دل چھوٹا نہ کرو۔"

پھر دوسرے خط میں لکھتے ہیں:ـ

"آج کل کی گرمی میں کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔
یہاں تک کہ میں نے کھانا بھی چھوڑ رکھا ہے کبھی ولایتی
دلیا دو انڈے کھا لئے، کبھی مچھلی کا ایک ٹکڑا الہ آباد سے
آئی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ بشرطیکہ نارنگی کا
جام بھی ہو۔ غرض ٹالتا رہتا ہوں۔ دال بھات کی
مقداری ترکیب آج کل کے موسم کے لئے کس قدر
ناموزوں ہے۔"

ان خطوط کو پڑھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ سچی رومانیت
اور سچی تخیلیت اگر ہم کو کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف
روزمرہ زندگی کی معمولی باتوں میں جن کو عموماً ہم اس قدر

بے کیف اور غیر دلکش پاتے ہیں۔ میں اب صرف چند اقتباسات اور دینا چاہتا ہوں اور اس کے بعد آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"مدت کے بعد آپ کا خط دیکھا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ میری طرف سے کوئی غیر عاقلانہ پیش قدمی نہیں ہوگی۔ آپ لوگوں کو میں نے جو کچھ لکھا وہ میرے احساسات کا اظہار تھا، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنے جذبات کو چھپاؤں۔ . . . "

اپنے دوست مولوی محمد افراغ صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"میری ترقی میں کچھ دیر ہوئی۔ جس قدر میری تمدنی رفتار تیز تھی، اقتصادی مشکلات پر جلد غالب نہ آسکا۔ اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا کہ کمند اگر لبِ بام پہنچ کر ٹوٹی تو اس حیثیت سے افسوس رہ جائے گا کہ توسیع میعاد کی درخواست، یعنی "کاسۂ گدائی" ہاتھ میں ہوگا، اور میں "بے مانگے موتی" چاہتا تھا جن کا اپنی قابلِ رشک زندگی میں ہزار موانع کے ساتھ بھی عادی رہا۔ بہرحال بخیر گذشت . . . . . "

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"عبدالماجد کی نئی تصنیف یعنی "فلسفۂ اجتماع" آپ نے دیکھی؟ "فلسفۂ جذبات" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو ایک نہایت ضروری موضوع پر لکھی گئی ہے اور دراصل اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ڈاکٹر لیبان نے جو حکمائے عصر میں ایک زندہ مصنف اور زبردست عالم نفسیات ہیں، فرنچ میں "روح الاجتماع" پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ مصریوں نے عربی میں کیا ہے یہ کتاب بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ۶ مہینے میں آپ کی عربی اتنی ہوسکتی ہے کہ آپ بے تکلف ادب الاساتذہ (کلاسیکل لٹریچر) سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کاروباری زندگی میں کیا آپ اتنا وقت نکال سکیں گے۔ دل پر رکھ لینے کی بات ہے۔ خاص کر جدید عربی تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ رسائل اور لغت سے پورا کلام نکل جاتا ہے۔ . . "

ایک اور خط میں بڑی لڑکی کو سمجھاتے ہیں:۔

"اپنی رفاقت، دلسوزی اور ہمدردی سے بار فکر کم کرتی رہو جس کے لئے کامل شائستگی کی ضرورت ہے۔ تمہاری ذرا سی کج ادائی یا کسی وقت معمولی اخلاق کی کمی بڑے سے بڑا جرم ہے۔ جو کوئی خاتون (لیڈی) کرسکتی ہے، اور جس کا فرض غم کا بھلا دینا ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"موسم بہت سخت ہے۔ کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ کوئیں کا پانی جب شہر میں بیماری کی شکایت ہو قابلِ اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لئے ابال کر کورے الواسوں میں ٹھنڈا کرکے پیو۔ کھانے میں کوئی چیز ثقیل نہ ہو۔ ٹھنڈی غذا، ٹھنڈا دودھ استعمال نہ کرو۔ ہر چیز شیر گرم ہونی چاہیئے جس میں کالرا کے جرمس اگر ہوں گے بھی تو فنا ہو جائیں گے۔ خاص کر "قاتلِ انسان" یعنے مکھی سے کھانے کی چیزوں کو بچاؤ، یعنے وہ جس غذا پر بیٹھے سمجھ لو متاثر ہوگئی۔ ایک بات کا اور خیال۔ کھنا عبد یا ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ کے

نوا کے دن رات میں اگر بارہ دفعہ بھی حلق سے اتارے تو کچھ حرج نہیں لیکن بی صفیہ آنکھ بچا کر شریک نہ ہو۔"

اسی لڑکی کو ایک خط میں تدبیر منزل کا سبق بس لطیف پیرایہ میں دیتے ہیں گویا کسی نہایت پر کیف شعر کے رموز سمجھا رہے ہیں:۔

"لکڑی لگ لی۔ آج بھی جاتی ہے۔ تنی اچھی ہے کہ جلانے کے عوض کھانے کو جی چاہے گا۔ سب باہر نہ رکھواؤ۔ نمک حرام غائب کر دے گا۔ یا بے ضرورت پھونک دے گا۔ ۔"

ایک دوست کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"دنیا کو ایسے ناپاک وجود سے خالی ہونا تھا جو بے ضرر اشخاص کی جائز آزادی اور قدرتی سکون و عافیت میں مخل ہو۔ میں تیسرے درجہ کی مخلوق کو اخلاقی حیثیت سے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتا رہا لیکن ایسی سخت وحشیانہ مثال اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔۔"

آخر میں میں پھر ایک بار دہرانا چاہتا ہوں کہ انا دی الاقتصادی کے اندر ایک خدا داد ذوق جمال تھا اور ان کی نگاہ حُسن شناس تھی۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے اندر اس حُسن کو دیکھ لیتے تھے جو اس کی سطحی کثافتوں میں چھپا ہوتا تھا، اور ان کا پیغام یہ تھا کہ حُسن مقصود بالذات ہے اور حسین چیز اپنی زندگی کے لئے کسی دوسری چیز کی دست نگر نہیں۔

(تلخیص "ادبی دنیا")

کالج سنسار

انجمن اتحاد کی سرگرمی

گذشتہ اشاعت میں "کابینہ کے ادبی کاروبار" کی سرخی کے تحت جو اطلاع شائع کی گئی تھی اس میں ان جلسوں کا ذکر نہیں کیا گیا تھا جو ادبی تقریری مقابلے کے لئے امیدواروں کے انتخاب کے سلسلے میں ہوئے تھے۔ اب اس کو بموجب وصول شدہ رپورٹ کے صراحتاً شائع کیا جاتا ہے۔ بین کلیاتی تقریری مقابلہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی نمایندگی کے لئے دو غیر معمولی جلسے انتخاب امیدواروں کیلئے طلب کئے گئے تھے۔ ایک انگریزی میں اور دوسرا اردو میں تھا۔ چونکہ پہلے اجلاس غیر تشفی بخش سمجھے گئے لہذا انکو مکرر طلب کیا گیا۔ اس طرح ان انتخابی مکرر جلسوں کی مجموعی تعداد ازروئے حساب چار ہوتی ہے۔

مجلس انتظامی کی رکنیت

مجلس انتظامی کے ایک رکن ابرار احمد صاحب متعلم سال اول نے اپنی تعلیم ترک کردی تھی اس لئے مجلس انتظامی نے جناب صدر کی خدمت میں اس نشست کے پُر کرنے کی ایک سفارشی تحریک پیش کی۔ جس پر جناب صدر نے پہلے انتخاب کے ایک ناکام امیدوار مظہر علی شریف صاحب متعلم سال اول کو رکنیت کے لئے نامزد فرمایا۔

سالار جنگ بین کلیاتی تقریری مقابلہ

نظام کالج کے جشن سالانہ کے موقع پر اُس کالج کی بزم ادب نے سالار جنگ بین کلیاتی تقریری مقابلہ منعقد کیا تھا جس میں ہماری مادر علمیہ سے ایک مسابقتی جماعت جو صلیح الدین اور علی مرتضیٰ صاحبان متعلم سال اول پر مشتمل تھی۔ بہ حیثیت مجموعی نشانات اول آئی اور "سالار جنگ کپ" حاصل کیا۔ انفرادی انعام اول بھی اول الذکر امیدوار نے حاصل کیا جنکو بزم کی جانب سے علحدہ انعام دیا گیا۔

اتھلیٹک اسوسی ایشن، اسپورٹس اور ہمارے امتیازات

قارئین "الموسیٰ" ہر سال کی آخری اشاعتوں میں روایتاً ان غیر معمولی امتیازات کو

انھیں عنفات میں لاحظہ فرماتے رہے ہیں اور انشاء اللہ یہ روایتیں مولوی سید احمد خاں صاحب اور دیگر اساتذہ عظام کی سعی بلیغ سے برابر جاری رہیں گی۔ ہمیں یہ لکھتے ہوے مسرت ہوتی ہے کہ مسلسل چار سال سے کلیہ کی رسہ کشی کی

رسہ کشی اور کالج

جیت کی رپورٹ برابر دیجاتی رہی ہے اور اب یہ اس کی کامیابی کا پانچواں سال ہے جو لایق قدر اور قابل مبارکباد ہے۔ اسی میدان میں کالج کی ٹیم ۷۶۰ گز ۱۸۸۰ گز ۴۴۰ گز کی دوڑ میں دوم رہی جسکی کامیابی کا سہرا وینکٹ راو کے سر ہے۔

رسہ کشی اور فوقانیہ

فوقانی رسہ کشی کی جماعت سے متعلق کسی قسم کی اطلاع شائع کرنا تحصیل حاصل ہے۔ کالج کا بچہ بچہ انکے چھ سالہ "دوامی بندوبست" سے بخوبی واقف ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس جماعت کے مقابل اپنا لوہا منوا تا۔ الحمد للہ انکی پیہم کامیابیوں کا یہ ساتواں خوشگوار سال ہے اور انکی رفتار خوش آیند مستقبل کا پیش خیمہ۔

ہم کلیہ برادری کو انکی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی درسی کامیابی پر اپنے زمانہ ہی میں اپنے اپنے نائب مقرر کردیتے تاکہ کلیہ بلدہ ہر سال سربلند رہے۔ اسی ٹورنمنٹ میں ۸۸۰ گز کی دوڑ ست نارائن نائڈو نے جیتی جو لائق ستائش ہے۔

وسطانی اسپورٹس

۴۴۰ گز اور ۲۲۰ گز کی دوڑ میں عبدالحفیظ اول آئے اور "لانگ جمپ" میں موصوف نے انعام دوم حاصل کیا۔ انکی یہ کوشش قابل داد ہے۔

اسپورٹس ممالک محروسہ سرکار عالی

مولوی سید احمد خاں صاحب کی کوششوں سے روایتی امتیاز رسہ کشی مسلسل تین سال سے اپنی مادر علمیہ ہی کو حاصل تھا، اس سال بھی رسہ کشی کی جماعت نے بازی جیتی اسطرح پیہم کامیابیوں کا یہ چوتھا سال ہے۔ علاوہ ازیں ان اسپورٹس میں ۸۰۰ گز کی دوڑ مسٹر ست نارائن نائڈو نے ۴۴۰ گز، ۲۲۰ گز کی دوڑ عبدالحفیظ نے جیتی۔ اور آخر الذکر طالب علم ممالک محروسہ سرکار عالی میں "لانگ جمپ" انعام اول کے مستحق قرار پائے۔ ہم مولوی سید احمد خاں صاحب اور ان کے ٹرینڈ رفقائے کار جو امتیازات کا باعث ہیں سب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ممالک محروسہ سرکار عالی فٹبال ٹورنمنٹ اور کلیۂ بلدہ۔

سال حال اس ٹورنمنٹ کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ہماری کوئی ٹیم ایسی نہ تھی جو فائینل میں نہ آئی ہو۔ فائینل کا دن کیا تھا ایک جاذب نظر منظر کا دن تھا کہ سٹی کالج کی فوجیں میدان کے ہر حصہ پر فاتحانہ حملہ کر رہی ہیں۔ ایک طرف اساتذہ مصروف عمل ہیں تو دوسری طرف کلیہ، ادھر فوقانی ٹیم جان توڑ کوشش کر رہی ہے تو ادھر وسطانی ٹیم اپنے حریف کو نیچا دکھانے میں سرگرم عمل ہے غرض یہ ٹیمیں نقارہ کی چوٹ کے ساتھ میدان میں داخل ہوئیں اور فتح کا نقارہ بجا کے

لوٹیں۔اس سال حیدرآباد کا کون ایسا قابلِ ذکر ٹورنمنٹ ہے جو مولوی جمیل احمد صاحب کی ساعیِ جمیلہ وکلیہ کی کوشش پیہم سے نہ جیتا گیا ہو۔ یہ لکھتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں کہ میدانی مشاغل کا امتیاز بھی، دوسرے اور علمی امتیازات کے علاوہ، ہماری مادرِ علمیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم اساتذہ صاحبان کو اور خصوصاً ان مشاغل کے روحِ رواں جناب جمیل احمد صاحب کو ان تمام کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اسی طرح کالج، فوقانیہ وسطانیہ کے کھلاڑی برادران بھی قابلِ مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی قسم کی خوش آئند امیدیں طلبائے برادران سے وابستہ ہونگی۔

فٹبال ٹیم نے سرمائی چھٹیوں میں میسور، بنگلور کا سفر کیا تھا۔ چونکہ اس کی ایک مفصل رپورٹ ایک مضمون کی شکل میں شریکِ رسالہ ہے اسلئے اقتباسات لے لینے کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

انجمن اتحاد شعبہ فوقانیہ

گزشتہ نمبر میں انجمن اتحاد شعبہ فوقانیہ کے ذکر میں بعض فروگزاشتیں ہوئی ہیں۔ اگر رپورٹ بروقت مل جاتی تو یقین ہے کہ یہ بات نہ ہوتی۔ اب معتمد صاحب انجمن نے اطلاع بھیجی ہے اسکے بموجب دو موضوعات جماعت واری مباحثے کے لئے دیئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک موضوع پر جماعت واری مباحثے کے علاوہ ایک عام جلسہ مباحثہ ۲ ربہمن ۱۳۴۹ف کو کیا گیا۔ اس کے علاوہ جماعتی معتمدین نے اپنی اپنی جماعت میں انفرادی طور پر متعدد مباحثے منعقد کئے جس کی رپورٹ معتمد صاحب انجمن کو برابر ملتی رہی۔

کابینہ انجمن کے ارکان کی جو فہرست پچھلی دفعہ شائع ہوئی اس میں ان ارکان کے نام رہ گئے تھے جس کا ہم کو بھی افسوس ہے اور معتمد صاحب انجمن کو بھی۔

(۱) عبد العزیز صاحب جماعت نہم (الف) (۲) فخر الدین صاحب جماعت نہم (ب)
(۳) رینو کا داس راؤ صاحب سکستھ فارم (ب) (۴) غیاث الدین صاحب جماعت ہشتم (الف)

جواں مرگ رینو کا داس

سکستھ فارم ب کے نمائندے اور طبقۂ فوقانیہ کے ہونہار طالب علم رینو کا داس راؤ صاحب کی جواں مرگی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل کس قدر رنج و ملال محسوس کرتا ہے اس کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس جواں مرگ کی یاد عرصہ دراز تک اس کے اساتذہ اور ساتھیوں کے دلوں میں تازہ رہیگی۔ انجمن اتحاد فوقانیہ کے پیامِ تعزیت کی ہم باحترام تائید کرتے ہیں۔

نئی کتابیں

معارف جمیل | تالیف جناب حکیم آزاد انصاری صاحب کراؤن تقطیع مجلد قیمت (عہ/۸) ملنے کا پتہ کاشانۂ باز گھانسی میاں بازار یا مکتبۂ ابراہیمیہ، عابد سڑک حیدر آباد۔

یہ حکیم آزاد انصاری صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے جو ان کے شاگرد تراب علی خاں صاحب باز نے شائع کیا ہے شروع میں خود حکیم صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے حالات اور اپنے کلام کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ حکیم صاحب عہد حاضر کے مشہور اور ممتاز شعرا میں ہیں۔ حیدر آباد اور دہلی کے شاعروں اور ادبی محفلوں میں ان کی غزلیں اور نظمیں عام طور پر مقبول اور پسندیدہ رہی ہیں۔ اکثر رسائل میں بھی ان کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ کلام میں جدت اور ندرت بھی ہے اور لطافت اور روانی بھی۔ باز صاحب نے یہ ادبی خدمت کر معارف جمیل کے ذریعہ آپ کا مرتب کلام اہل ذوق کو بہم پہنچایا لایق قدر ہے۔

ارسطو جاہ | از پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ادارۂ ادبیات اردو قیمت (۶/)

نواب اعظم الامرا، ارسطو جاہ عہد نواب آصف جاہ دوم کے ایک مشہور وزیر اور حیدر آباد کے ان مشاہیر میں سے ہیں جن کا دکن بلکہ ہندوستان کی تاریخ بنانے میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ یہ سیاسی معاملہ فہمی اور ادبی ذوق، فیاضی و بلند حوصلگی میں مشہور زمانہ تھے۔ پروفیسر مجید صدیقی نے ان کے حالات اور کارناموں پر آسان انداز میں یہ رسالہ تالیف کر کے اہل ملک کے آگے ایک اہم تاریخی شخصیت کو پیش کیا ہے جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ نہ صرف تاریخ کے طلبہ بلکہ عام طور پر نوجوانان ملک اس رسالے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

سیّد محمد

جگہ کی قلت کی وجہ سے دیگر تبصرے اس نمبر میں شائع نہ ہو سکے۔ آیندہ نمبر میں اسکی تلافی کیجائیگی۔ انشاءاللہ۔